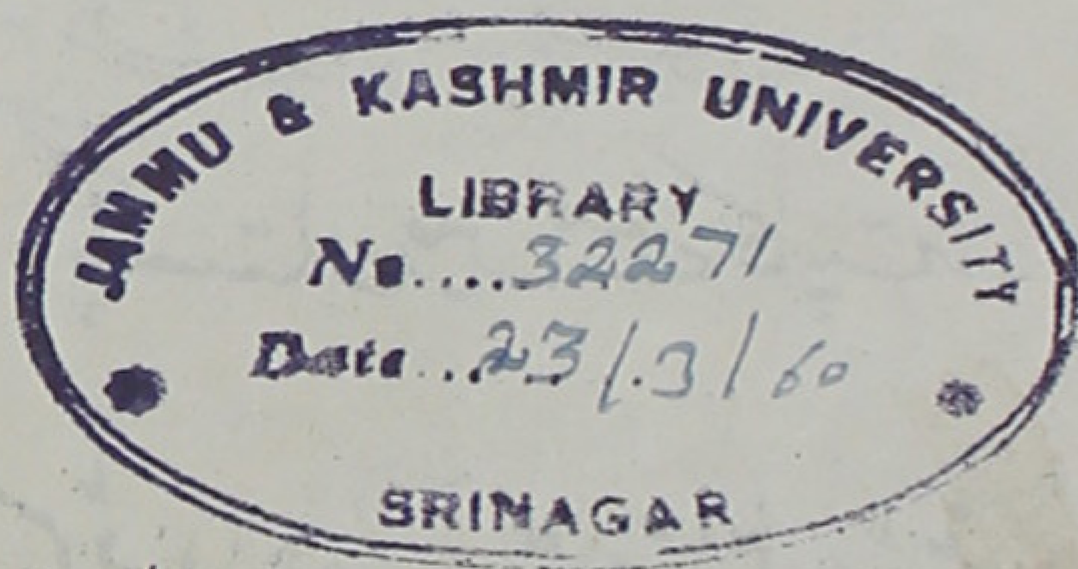
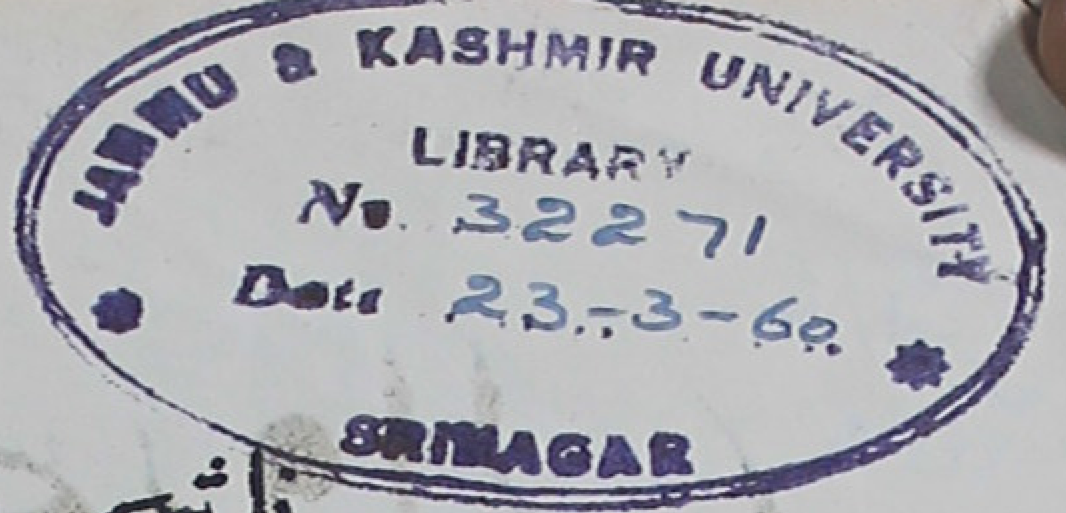
# جوئے رواں

باز گلبانگِ پریشاں می زنم




حامد اللہ افسر

**Sh. Ghulam Mohamad & Sons.**
Book-Sellers, Publishers & Stationers
Govt., Order Suppliers




ناشر



انوار بک ڈپو، ایجوکیشنل پبلشرز لکھنؤ

ستمبر ۱۹۵۴ء

نشر اقومی پریس لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ

مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، مقابل ڈینسو ہال

کراچی

قیمت عہ

در جوئے روانِ ما بے منتِ طوفانے
یک موج اگر خیزد آں موج ز جیحوں بہ

اقبال

# فہرست عنوانات

## عالمِ اسرار



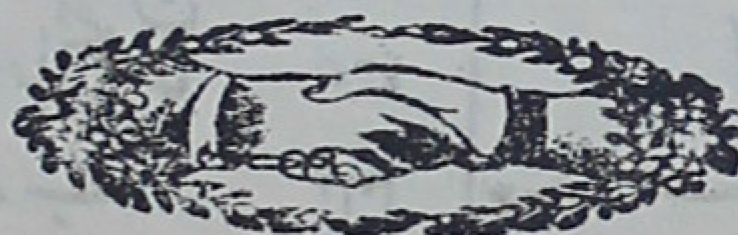
## سوز و ساز



## گلبانگ



## راہِ دگر



# عالم اسرار

نامۂ خوش خبر از عالم اسرار بیار

حافظ

**Title** [redacted]

**Author** [redacted]

**Accession No.** [redacted]

**Call No.** [redacted]

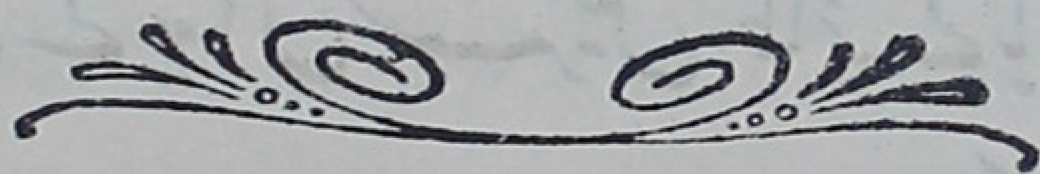
| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# مقاماتِ نوا

۱۹۵۳ء

کھولے ہوئے دل کا در، آیا ہے پھر ترے گھر
مرتبہ دانِ قضا، رتبہ شناسِ قدر
اس کی فضاؤں میں گم، انجم و شمس و قمر
اس کے یہاں جبرئیل، طائرِ بے بال و پَر
دل میں ہے رازِ حیات. لب پہ رموزِ کتاب

جسم جہاں کا اسیر، دور جہاں سے نظر
سازِ زمین و زماں، رازِ بہار و خزاں
محرمِ ہر خیر و شر، مرکزِ ہر خشک و تر
اس کی جلو میں رواں ظاہرِ لیل و نہار
اس کی نظر سے عیاں باطنِ شام و سحر
ساز میں پنہاں ہے سوز، سوز سے پیدا ہے ساز
لب پہ ہے خنداں بہار، دل میں چھپے ہیں شرر



# نعرۂ مستانہ

سنہ ۱۹۵۰ء

کس کس کو تو نے کیا کیا نہ بخشا ، بار الہا، بار الہا
قدرت کا تیری ادنیٰ کرشمہ ، ایک ایک ذرّہ ایک ایک دنیا
ہر اک زباں پر تیرا فسانہ ، ہر ایک لب پر تیرا ترانہ
بیگانہ سب سے ، سب کا یگانہ ، ظاہر میں پردہ باطن میں جلوہ

خلوت کے اندر محفل کے اندر، دریا کے اندر ساحل کے اندر

آنکھوں سے پردہ گھر دل کے اندر ہر شے میں دیکھا ہر شے میں پایا

سوتے ہوؤں کو تو نے جگایا، روتے ہوؤں کو تو نے ہنسایا

کھوئے ہوؤں کو تو نے ملایا، گرتے ہوؤں کو تو نے سنبھالا

ہے تیرا پردہ شب کی سیاہی، تاروں نے دی ہے تیری گواہی

ہے تیرا مظہر ہر شے الٰہی، ہر شے سے ظاہر ہے نور تیرا

خشکی کبھی ہے باراں کبھی ہے، مشکل کبھی ہے آساں کبھی ہے

ظاہر کبھی ہے پنہاں کبھی ہے، گھر گھر اندھیرا گھر گھر اُجالا

بے ساز بن کر باساز بن کر، خاموش رہ کر آواز بن کر

ہر راز میں ہے ہمراز بن کر، خود راز ہو کر ہر راز کھولا

ظاہر میں کثرت باطن میں وحدت، ظاہر میں جلوت باطن میں خلوت
ظاہر میں رحمت، باطن میں رحمت، پردے میں جلوہ، جلوے میں پردا
اقرار بن کر، انکار بن کر، آسان بن کر دشوار بن کر
رفتار بن کر گفتار بن کر، ہر رنگ میں ہے تو آشکارا
خود ہی مسافر خود ہی سفر ہے، خود ہی ہے منزل خود راہبر ہے
خود ہی اِدھر ہے خود ہی اُدھر ہے، تجھ تک گیا ہے ہر ایک ستا
خود ابتدا ہے خود انتہا ہے، خود مدعا ہے خود آسرا ہے
خود ہی اثر ہے خود ہی دعا ہے، ہر ایک دل کا تو ہے سہارا



# رُوح کا در

۱۹۵۱ء

کیا ہے وہ، جو اس کے قبضے میں نہیں
نعمتیں انمول دیتی ہے دعا

بارگاہِ حق میں پہنچی یا نہیں
اپنے منہ سے بول دیتی ہے دعا

لائے تو جامِ زہر ابِ حیات
اُس میں امرت گھول دیتی ہے دُعا
عرش تک جانے سے پہلے اے ندیم
رُوح کا در کھول دیتی ہے دُعا



# درگہِ حُسن و عشق

۱۹۵۳ء

کہاں کی طاعت، کہاں کی بخشش، حرم خدا کی دوکاں نہیں ہے
یہ درگہِ حسن و عشق زاہد! مقامِ سود و زیاں نہیں ہے

گماں تھا منزل کا مجھ کو جس پر وہاں پہنچ کر کھُلا یہ عقدہ
کہ میں بھی گم کردہ راہ تو بھی، یہاں کوئی راہ داں نہیں ہے

حدود کی اِس قید سے نکل کر ملے گا تجھ کو مقام اپنا
ترى جگہ خاکداں نہیں ہے ترا مقام آسماں نہیں ہے
شرار ہیں آہِ آتشیں کے، سمجھ رہے ہو جنھیں ستارے
غبار ہے اک دلِ حزیں کا، یہ آسماں آسماں نہیں ہے
یہ اقتضا ہے حیاتِ نو کا بنا کریں اک جہانِ تازہ
کہ درخورِ التفاتِ ساقی، یہ سال خوردہ جہاں نہیں ہے
یہ زندگی کا سفر ہے ہمدم، اِسے ہے حاصل ثباتِ دائم
ہے کارواں اب بھی رہ گزر میں، مگر یہ وہ کارواں نہیں ہے
نظر کو وسعت نصیب ہو گی، حدوں سے نکلے گا جب تخیّل
حرم بھی اے شیخ سطح بیں سُن مکاں ہی لامکاں نہیں ہے

کرے جو ہمّت تو کچھ فضائیں ان آسمانوں کے پار بھی ہیں
یہ میں نے مانا سکوں میسّر تجھے تہِ آسماں نہیں ہے



# نالۂ بیباک

سنہ ۱۹۵۳ء

کام لیں گر نالۂ بیباک سے
ٹوٹ کر تارے گریں افلاک سے

ہو اگر پیدا امغانِ کارواں
شعلہ لو دے گا رگِ ہر تاک سے

تو نے ساقی میری توبہ کا ضمیر
پھونک ڈالا شعلۂ نمناک سے

پھوٹ نکلے آسماں سے رودِ نور
رخنہ کر دے نالۂ بیباک سے

ایک حالت پر یہ رہ سکتی نہیں  ڈر گیا کیوں گردشِ افلاک سے
منعکس کیونکر ہوں اسرارِ حیات  زنگ پہلے دور کر ادراک سے
اللہ اللہ یہ تصرّف عشق کا  حشر اُٹھا ایک مُشتِ خاک سے
پھول بکھرے تھے چمن میں چار سو  تو نے دامن بھر لیا خاشاک سے
سوزِ دل سے پہلے خود کو پھونک لے  خود کو پیدا کر پھر اپنی خاک سے
اک چمن میں ہو گیا تو گوشہ گیر  تو نے یہ حاصل کیا ادراک سے
پھر مصیبت میں ہے دنیا، خضرِ راہ  پھر اُٹھے گا ایشیا کی خاک سے

ہے خرد افروز **افسر** کا جنوں
ڈر نہ جانا اِس گریباں چاک سے

# مہمان اور میزبان

سنہ ۱۹۵۱ء

بہت ہی مقتدر شاہوں میں تھا سفّاح عبداللہ[ع۵]
یہی عبّاسیوں کے عہد کا پہلا خلیفہ تھا

---

ع۵ ابو العبّاس عبداللہ بن محمد، ۱؍ جمادی الاوّل ۱۳۲ھ مطابق یکم جنوری ۷۵۰ء کو تخت نشین ہوا یہ خلیفہ چونکہ فطرتاً خوں ریز تھا اس لئے سفّاح لقب ہوا، چار برس حکومت کر کے بتاریخ ۱۳؍ ذی الحجہ ۱۳۶ھ مطابق مئی ۷۵۴ء بمقام انبار راہی ملک عدم ہوا،

پریشاں حال تھے وابستگانِ دولت پیشیں
مصیبت امویوں پر آپڑی تھی حشر برپا تھا
انھیں میں ایک بدقسمت تھا ابراہیم شہزادہ
وہی سب سے بڑا دراصل باغی سمجھا جاتا تھا
اُسے ارکانِ دولت روبرو لائے خلیفہ کے
کہ اِن ارکانِ دولت کو بہت اس پر بھروسا تھا
حکومت کو بہت ہی ایسے لوگوں کی ضرورت تھی
کہ خود آگاہ تھا وہ کارداں تھا مردِ دانا تھا

خلیفہ نے بہت عزّت سے ابراہیم کو رکھا
عطا وہ منصب عالی کیا اس کو جو زیبا تھا

کیا گھر رفتہ رفتہ اُس نے عبداللہ کے دل میں

حقیقت یہ ہے ساری سلطنت پر اُس کا قبضہ تھا

خلیفہ نے بلا کر اُس سے اک دن اس طرح پوچھا

"ہمارے ڈر سے ابراہیم جب تو چھپتا پھرتا تھا

کوئی انسان ایسا بھی تری نظروں سے گزرا ہے

جو اپنے رنگ میں بے مثل و بے ہمتا تھا یکتا تھا؟"

کہا یہ سُن کے ابراہیم نے "ہاں میں نے دیکھا ہے

اک ایسا شخص دنیا بھر میں جو ثانی نہ رکھتا تھا

ہوا روپوش جاسوسوں سے بچ کر جب میں حیرہ میں

وہاں بھی لشکر شاہی کے آجانے کا خطرہ تھا

بلآخر جب یہ خطرہ اور بھی نزدیک آ پہنچا
تو مجبوراً مرے قدموں تلے کوفے کا رستہ تھا
وہاں پہنچا تو غربت نے پریشاں کر دیا مجھ کو
شناسا ہو جو میرا، ایک بھی انساں نہ ایسا تھا
غرض گلیوں میں پھرتے پھرتے اک ڈیوڑھی پہ جا نکلا
جواں سال ایک شہری سامنے مسند پہ بیٹھا تھا
کہا میں نے یہ اُس سے "سُن خدا کے نیک دل بندے
میں جان اپنی بچانے کو تری بستی میں آیا تھا
مسافر ہوں، پریشاں حال ہوں، آفت کا مارا ہوں
مجھے مدّت سے ظالم دشمنوں نے گھیر رکھا تھا

اماں کی بھیک لینے آج تیرے در پہ آیا ہوں
اماں اِس در پہ مل جائے گی، یہ مجھ کو بھروسا تھا
جواب اُس نے دیا، ہے آج سے مہمان تو میرا
مرے سایہ میں آجانا، ترہی قسمت میں لکھا تھا
خدا تیرا نگہباں ہے، اُسی نے تجھ کو بھیجا ہے
اُسے منظور دشمن سے ترا پیچھا چھڑانا تھا"
بہت دن تک رہا میں اِس عجیب انسان کے گھر میں
بہت ہی مہرباں اِس گھر میں ہر اک مجھ پہ رہتا تھا
یہ تھا معمول اِس مردِ خدا کا ظلِ سبحانی!
مسلح ہو کے وقتِ صبح وہ ہر روز جاتا تھا

خدا جانے کہاں سے تھک کے وقتِ عصر روزانہ
پریشاں حال پژمردہ وہ اکثر واپس آتا تھا
کہاں جاتا ہے؟ کیوں آتا ہے اتنا مضمحل ہو کر؟
یہ آخر ماجرا کیا ہے میں اکثر سوچا کرتا تھا
میں اک دن پوچھ ہی بیٹھا کہ "کیا تشویش ہے تجھ کو؟"
میں تھا مجبور، ذوقِ آگہی کا یہ تقاضا تھا
کہا اس نے کہ "میرے باپ کا قاتل ہے اک ظالم
وہ حیرہ میں چھپا بیٹھا ہے کوئی مجھ سے کہتا تھا
اسے کہتے ہیں ابراہیم بیٹا ہے سلیماں کا
کوئی اس نام والا کیا کہیں تو نے بھی دیکھا تھا"

خود اپنا نام سُن کر موت کی صورت نظر آئی
جسے وہ ڈھونڈتا تھا، وہ اُسی کے گھر میں رہتا تھا
کہا میں نے کہ "ابراسیم سے میں خوب واقف ہوں
تلاش اُس کی تجھے ہے، یہ بھلا میں کب سمجھتا تھا"
وہ اک دم جوش میں بولا "کہاں ہے وہ بتا مجھ کو
کہیں کیا حال ہی میں تو نے اُس ظالم کو دیکھا تھا"
جواب اُس کو دیا میں نے کہ "وہ بدبخت خود میں ہوں
جسے تو ڈھونڈتا مدت سے دنیا بھر میں پھرتا تھا
اُڑا دے میری گردن جرم کا اقرار ہے مجھ کو
قصاص اس کا تجھے دوں یہ مری قسمت میں لکھا تھا

یہ سُن کر مجھ سے ، طاری ہو گیا اُس پر عجب عالم
وہ کچھ مبہوت سا ، حیران سا ، حیرت زدہ سا تھا
غرض کچھ سوچ کر اُس نے کہا "سُن اے مرے مہماں!
تجھے میری اماں میں اِس طرح ہرگز نہ آنا تھا
خدا عادل ہے ، وہ خود حشر میں تجھ کو سزا دے گا
میں کیا لوں تجھ سے بدلا ، ہو گیا جو کچھ کہ ہونا تھا
مگر اب دور ہو جا تو مری نظروں کے آگے سے
کہ میں یہ بھول جاؤں ، کس نے کس کو مار ڈالا تھا
عرب مشہور ہیں مہماں نوازی میں ، تواضع میں
مگر یہ واقعہ اُس ملک میں بھی حیرت افزا تھا

# بزم گہِ تصوّرات

سنہ ۱۹۳۰ء

دیکھ کہ نور و نار ہیں دونوں مری تجلّیات
کھُل نہ سکا کسی سے جو میں ہوں وہ رازِ کائنات
اس سے گزر کہ ہو عیاں آگہیِ دل و نظر
ہے یہ جہانِ رنگ و بو بزم گہِ تصورات

حق کی صدا تھی کربلا، گونج ہے اُس کی آج تک
ایں سوئے دجلہ و فرات، آں سوئے دجلہ و فرات
قلب و نظر کی آگہی، گر ہو نصیب خود ہے تو
رمز شناسِ کائنات، پردہ درِ حریمِ ذات
مژدۂ نو بہار دے باغِ خزاں رسیدہ کو
کر اسے تازگی عطا کہنہ ہے بزمِ کائنات
تیرے حجاب سے بنے دیر و حرم کے راستے
ہیں مری جستجو کے نام کعبہ ہو یا کہ سومنات
آج کہیں ہو پھر کوئی، وقفِ فغانِ بے خروش
کانپ اُٹھا لرز گیا قصرِ ضمیرِ کائنات

# سوز و ساز

اے لذتِ آں سوز کہ ہم ساز ہست

**Title** [redacted]

**Author** [redacted]

**Accession No.** [redacted]

**Call No.** 8 [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# شعلۂ کردار

سنہ ۱۹۴۸ء

جن کو ہر حالت میں خوش اور شادماں پاتا ہوں میں
ان کے گلشن میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

اللہ اللہ موجزن ہے کس قدر بحرِ حیات
دل میں ہر ذرے کے رقصاں اک جہاں پاتا ہوں میں

کچھ تو بتلا، کیا مآلِ علم و حکمت ہے یہی
زنگ آلودہ تری دانائیاں پاتا ہوں میں
رنگ لائیں جب منظم ہو گئیں خود غرضیاں
ہر طرف عالم میں رزم آرائیاں پاتا ہوں میں
جن کو اِس دنیا میں آجاتا ہے خوش رہنے کا فن
شاخِ پرطوبیٰ کی اُن کا آشیاں پاتا ہوں میں
پاتی ہے نشو و نما زندہ دلی سے زندگی
شادمانی میں حیاتِ جاوداں پاتا ہوں میں
جو نئی قدروں کے دلدادہ ہیں اُن کے دل پہ بھی
نقشِ پائے رہروانِ باستاں پاتا ہوں میں

کیسی حیرت ہی کہ خود اُن کو ہے مزدوری سی عار
جن کو مزدوروں کے حق میں تر زباں پاتا ہوں میں

وہم ماضی کو بدلتے ہیں جو ہم حال سے
جاگزیں انکی بہاروں میں خزاں پاتا ہوں میں

بھیجتے ہیں لعنتیں جو اہلِ زر پر خود انھیں
اہلِ زر کے در پہ خم مثلِ کماں پاتا ہوں میں

وعظ کہتے ہیں محبّت کے، مودّت کے جو زور
گھر میں خود اپنے، انھیں چنگیز خاں پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں کو چہائے معصیت میں گھومتے
بر سرِ ممبر جنھیں رطب اللّساں پاتا ہوں میں

کر رہا ہے آج پھر آہیں کوئی آتش بہ دل
آسماں ایک اور زیرِ آسماں پاتا ہوں میں
صبح کی منزل کا تاروں سے پتا کیا پوچھتا
ظلمتِ شب کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

چاند کے اُس پار، سورج سے اُدھر، تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں
کس قدر افسانہ خوانی کو ہے اے **افسرؔ** فروغ
آج کل ہر میز پر "پرچھائیاں"[۱] پاتا ہوں میں

---

[۱] مختصر افسانوں کے ایک مجموعہ کا نام ہے۔

# ہندوستان اور انگلستان

(یہ نظم ایک دوست کے لئے لکھی گئی تھی جو اُس وقت انگلستان میں مقیم تھے)

سنہ ۱۹۰۸ء

وہاں ویرانۂ درد دل ہر گلستاں ہے جہاں میں ہوں
وہاں ہر ایک گل شعلہ بداماں ہے جہاں میں ہوں
وہاں سر سے قدم تک شمع لرزاں ہے جہاں میں ہوں
وہاں ہر بزم اک گورِ غریباں ہے جہاں میں ہوں

وہاں کی زندگی خود سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں
وہاں کی موت تک خود سے پشیماں ہے جہاں میں ہوں
وہاں مہتاب افسردہ ہے پژمردہ ہے گریاں ہے
وہاں سورج چراغِ زیرِ داماں ہے جہاں میں ہوں
وہاں کٹتے ہیں سر صدہا برس پہلے کے قصوں پر
وہاں تاریخ خوں ریزی کا ساماں ہے جہاں میں ہوں
وہاں ذرّوں میں اک ہیجان سا پیدا ہے ہر لمحہ
وہاں پوشیدہ ہر قطرے میں طوفاں ہے جہاں میں ہوں
وہاں انسانیت پر فوقیت ہے فرقہ بندی کو
وہاں انسان ہندو ہے مسلماں ہے جہاں میں ہوں

وہاں ہر اک مسرت معصیت کا حکم رکھتی ہے
وہاں ہر عیش اک خوابِ پریشاں ہے جہاں میں ہوں

وہاں جیتے ہیں لیکن لوٹ کر مٹی میں جیتے ہیں
وہاں کیڑِ دل سے بد تر نوعِ انساں ہے جہاں میں ہوں

وہاں ساماں میسّر ہی نہیں ہے جسم پوشی کا
وہاں انسان اب تک نیم عریاں ہے جہاں میں ہوں

وہاں یہ ایک دھجّی بھی غنیمت سمجھی جاتی ہے
گلے میں اک گریباں ہی گریباں ہے جہاں میں ہوں

وہاں ویران دل چہرے ہو تق، جسم بے رونق
ہر آبادی وہاں اک ہُو کا میداں ہے جہاں میں ہوں

وہاں ایک ایک دانے پر ہے ساہوکار کا دعویٰ
خود اپنے کھیت سے محروم دہقاں ہے جہاں میں ہوں
وہاں کی شاعری کا ہے تخاطب جنسِ افضل سے
وہاں دلکش خطِ رخسارِ جاناں ہے جہاں میں ہوں
وہاں مذہب کا مقصد کچھ نہیں جز خوف انگیزی
وہاں انساں کا ہر سانس عصیاں ہے جہاں میں ہوں
مقیّد ہے روایاتِ کہن کے جال میں انساں
وہاں ہر وہم ماضی جزوِ ایماں ہے جہاں میں ہوں
ہوئی ہے شاعری آزاد گو بحر و قوافی سے
مگر افسرؔ وہاں اب تک غزل خواں ہے جہاں میں ہوں

(۲)

وہاں ہر دشت و در گلشن بداماں ہے جہاں تم ہو
ہر آبادی گلستاں در گلستاں ہے جہاں تم ہو
سکوں انگیز شامِ سنبلستاں ہے جہاں تم ہو
تبسّم ریزِ صبحِ کوہساراں ہے جہاں تم ہو
وہاں ہر ایک مشکل آج آساں ہے جہاں تم ہو
وہاں ہر درد کا موجود درماں ہے جہاں تم ہو
وہاں زندہ دلی ہے ایک جوہر زندگانی کا
وہاں عیش و مسرّت جزوِ ایماں ہے جہاں تم ہو
وہاں امروز کو فردا کے غم سے ہے سبکدوشی

وہاں ہر گام پر راحت کا ساماں ہے جہاں تم ہو
میسّر ہے وہاں سورج سے دل گرمی و شادابی
وہاں راحت فزا ماہِ درخشاں ہے جہاں تم ہو
وہاں عنقا نہیں ہے مہر و الفت لطف و ہمدردی
وہاں نوعِ بشر سے اُنس ارزاں ہے جہاں تم ہو
فضا لبریز ہے لحنِ طرب افزا کی تانوں سے
وہاں حسنِ تبسم ریز رقصاں ہے جہاں تم ہو
وہاں ہر راہ پر موجِ ہوائے فرحت دل ہے
وہاں ہر موڑ پر روحِ بہاراں ہے جہاں تم ہو
وہاں ہے عام ہر موسم میں کشتِ دل کی شادابی

مسرت بیز موجِ برق و باراں ہی جہاں تم ہو
وہاں ہر گام پر تجدید کے جلوے ہیں آسودہ
وہاں ہر وہمِ ماضی گریہ ساماں ہی جہاں تم ہو
اب اتنی بات خود انصاف سے کہہ دو ذرا تم ہی
وہاں بھی کوئی افسرؔ سا سخنداں ہے جہاں تم ہو



# ایک گدائے بے نوا

۱۹۳۰ء

اک گدائے بے نوا سے آج یہ میں نے کہا
کیا بھلا لگتا ہے تجھ کو بھیک در در مانگنا
بات یہ کیا ہے کہ محنت سے حذر کرتا ہے تو
دوسروں کے سوکھے ٹکڑوں پر بسر کرتا ہے تو

تیری بیکاری کا کُل ہندوستاں پر ہے اثر
بار ہے تیرا وجودِ نامبارک قوم پر
ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو
ہٹا کٹا ہے مگر محنت سے گھبراتا ہے تو
ٹھوکریں کھلواتی ہے کمبخت بیکاری تری
جھڑکیوں کی نذر ہو جاتی ہے خودداری تری
عاجزی سے آ گئی پستی ترے اخلاق میں
کون ہو سکتا ہے تجھ سے پست تر آفاق میں

---

سُن کے میری بات بولا وہ گدائے بے نوا

تو نے جو کچھ بھی کہا بابا وہ بالکل سچ کہا
کچھ کہوں میں بھی، اگر برہم نہ ہو تیرا مزاج
میری اِس حالت کا ذمّہ دار ہے تیرا سماج
میری ویرانی کا باعث تیرے ساہوکار ہیں
جن کے گھر میں سیم و زر کے ہر طرف انبار ہیں
یہ لئیمانِ تنک ظرف و دنی و تنگ دل
ملک و ملّت کی فلاکت کا سبب ہیں مستقل
سونے چاندی سے زمیں کا پیٹ بھر دیتے ہیں یہ
لاکھوں انسانوں کی روزی دفن کر دیتے ہیں یہ

---

تو نے خود داری سے جو محروم ٹھہرایا مجھے
طعن مجھ پر تیرا یہ، بابا پسند آیا مجھے
لیکن اتنا تو بتا دے مجھ کو تو اے ہوشمند
کتنے رکھتے ہیں تری ملّت میں یہ وصفِ بلند
کچھ خبر ہے اس چمن میں یہ کلی کھلتی نہیں
یہ وہ دولت ہے جو تیرے ملک میں ملتی نہیں
بے خبر اس نور سے محروم ہے تیری جبیں
کیا غلاموں کو بھی مل سکتی ہے یہ دولت کہیں

---

اور گدائی کا جو مجھ کمبخت پر الزام ہے

میرے مشفق! ملک میں تیرے یہ پیشہ عام ہے

ہوتی ہے قدموں پہ زر کے جبہ سائی رات دن

کتنے خوش پوشاک کرتے ہیں گدائی رات دن

در پہ زرداروں کے ملتے ہیں یہ فرزندانِ زور

دست بستہ، سر خمیدہ، لب پہ ہر دم جی حضور

چاپلوسی میں خوشامد میں نہیں اِن کا جواب

ڈالے رہتی ہیں یہی چیزیں گدائی پر نقاب

---

ہیں گداپوشیدہ کچھ مذہب کے ٹھیکہ دار بھی

کاسہ بن جاتے ہیں اکثر جبہ و دستار بھی

نام پر مذہب کے ڈاکے ڈالتے ہیں رات دن
پیٹ مکّاری سے اپنا پالتے ہیں رات دن
کچھ عذابِ حق سے بھی یہ فتنہ گر ڈرتے نہیں
یہ ڈراتے ہیں خدا سے، خود مگر ڈرتے نہیں
اپنے فن میں یہ بہت ہوتے ہیں کامل اے عزیز
ان کے پھندے سے نکل جانا ہے مشکل اے عزیز
کرتے ہیں مطعون خود مذہب کو ظالم بے حیا
ہوتے ہیں بدنام مذہب کے حقیقی رہنما

---

شاعروں میں بھی نہیں باگداؤں کی کمی

بھیک پر یہ بھی بسر کرتے ہیں اکثر زندگی
پہلے اک کاسہ قصیدے کا لئے پھرتے تھے یہ
در پہ زرداروں کے جاکر منھ کے بل گرتے تھے یہ
اب بھی کچھ کچھ ہے خوشامد کے قصیدوں کا رواج
لیکن اب اچھا نہیں ان کو سمجھتا ہے سماج

---

کچھ سنا ان کی گدائی کتنی ہیبت ناک ہے
شکر ہے میری گدائی مکر سے تو پاک ہے
حال کس کس کا کہوں بابا تجھے ہے کیا خبر
زندگی کی ہر روش میں ہے گدائی جلوہ گر

---

# اے مسافر!

سنہ ۱۹۳۸ء

(۱)

راستہ پیچیدہ بھی ہے سخت بھی دشوار بھی
اونچی نیچی راہ پر بکھرے پڑے ہیں خار بھی
ہر قدم پر سنگ ریزوں کا ہے اک انبار بھی

تو تھکا ماندہ بھی ہے مجبور بھی ناچار بھی
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۲)

آندھیاں ہیں رہنما لیکن وہی دشمن بھی ہیں
تیری آنکھوں کے لئے وہ خاک در دامن بھی ہیں
یہ ہیں وہ رہبر کہ جو رہبر بھی ہیں رہزن بھی ہیں
ان کی آہیں جانفزا بھی ہیں شرر افگن بھی ہیں
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۳)

مثل اژدر راستہ سارا ہے بل کھایا ہوا

چلنے والوں کی قدم بوسی کو ترسا یا ہوا
پاس منزل کے مگر منزل سے بھٹکا یا ہوا
گھُپ اندھیرے میں کبھی کھو یا کبھی پا یا ہوا
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۴)

راستہ گذرا ہے میدانوں سے بل کھاتا ہوا
گاہ دامن کھینچتا اور گاہ پھیلاتا ہوا
جھاڑیوں سے ہو کے نکلا خود کو اُلجھاتا ہوا
وادیوں میں ڈوبتا ٹیلوں سے ٹکراتا ہوا
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۵)

دیکھ ہیں بھٹکے ہوئے مدت سے تیرے ہمسفر
ان کو رستہ کی نہ رہبر کی نہ منزل کی خبر
تو مسافر ہے تجھے رکھنی ہے اِن پر بھی نظر
ان کو خطرے سے بچانا ہے کے ان کا راہبر
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۶)

ہونگے مستقبل کے رہرو فکرِ مستقبل سے دور
وقت کے دریا میں ہونگے غوطہ زن ساحل سے دور
ان کی اک منزل نئی ہوگی تری منزل سے دور

اپنی ہر مشکل پہ شاداں تیری ہر مشکل سے دور
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے

(۷)

تیرے نقش پا بنیں گے راہبران کے لئے
تیری منزل ہو گی سنگِ رہگذران کے لئے
کھول دے گا سیکڑوں منزل کے در ان کے لئے
تیری ہر تاریک شب ہو گی سحر ان کے لئے
اے مسافر! اے مسافر! تیری منزل دور ہے



# طلوعِ خورشیدِ نو

سنہ ۱۹۴۵ء

امن کے مشرق سے پھر ظاہر سحر ہونے کو ہے
آفتابِ عافیت پھر جلوہ گر ہونے کو ہے
عہدِ گل آنے کو ہے پھولوں کی بارش کے لئے
ختم دورِ برق و بارود و شرر ہونے کو ہے

جلوہ گر ہونے کو ہے صبحِ بہارِ آشتی
ظلم سے آزاد کُل نوعِ بشر ہونے کو ہے
ختم ہونے کو ہے وہم یاستاں کی رات اب
آفتابِ فکرِ فردا جلوہ گر ہونے کو ہے
خضر کے اوصاف ہر رہرو کو بخشے جائیں گے
رہزنوں سے پاک اب ہر رہگذر ہونے کو ہے
ظلم و خود غرضی کا پرچم ہو رہا ہے سرنگوں
امن و راحت کا نشاں پیش نظر ہونے کو ہے
زیست کی لذّت سے ہو گی آشنا نوعِ بشر
یعنی ہر اک تلخ اب شہد و شکر ہونے کو ہے

فرق مٹ جانے کو ہے انسان اور انسان کا
وحدتِ اقوامِ عالم جلوہ گر ہونے کو ہے
مل رہا ہے خاک میں قصرِ روایاتِ قدیم
مطلعِ خورشیدِ نَو ہر بام و در ہونے کو ہے



# آج کل

۱۹۴۱ء

ہے بشر کتنا حقیقت سے گریزاں آج کل
ہر توہم ہر شگوں ہے جزوِ ایماں آج کل

خضر خود بھٹکے ہوئے ہیں زندگی کی راہ سے
ہو گیا زہر ہلاہل آبِ حیواں ہے آج کل

گو غلامی نذرِ تہذیب و ترقی ہو چکی
بک رہا ہے پھر بھی ہر کوچے میں انساں آج کل

ہو رہا ہے رونما اک درد ہر ساعت نیا
گو کہ ہے ہر درد کا موجود درماں آج کل

ذکر کرتے ہیں خدا کا ہم کچھ اس انداز سے
جیسے خود انساں خدا کا ہے نگہباں آج کل

کر لئے تعمیر دنیا ہی میں دوزخ سیکڑوں
کانپتا ہے آدمِ خاکی سے شیطاں آج کل

ہو رہا ہے مکر سے حیلے سے ہر باطن سیاہ
گو ہے ظاہر میں بہت اخلاق ارزاں آج کل

گو ہر اک اقلیم ہے محروم سلطاں سے مگر
ہر مدبّر زعم میں اپنے ہے سلطاں آج کل

اب نہ ہمّت ہم میں باقی ہے نہ جرأت ہم میں ہے
ہے یہی مشکل کہ ہر مشکل ہے آساں آج کل

دی گئی تھی خار کو دولت کشودِ کار کی
پھر بھی ہر گلچیں ہے افسر تنگ داماں آج کل



# ایک پیغام

سنہ ۱۹۴۰ء

(لاہور کے چند طلباء کی دعوت کے جواب میں)

ہے صبح اُٹھو، خواب سے دنیا کو جگا دو
اور امن طرب خیز کا پیغام سنا دو
ماضی کے سوا یاد کوئی چیز نہیں ہے
یہ حال تمہارا ہے تو ماضی کو بھلا دو

تنہا ابدی زیست بھی اک بارگراں ہے
گمراہ خضر ہیں انھیں منزل کا پتا دو
مفقود ہوئے جاتے ہیں آزادی جلوے
دنیا سے غلامی کی ضلالت کو مٹا دو
ہے رات قدامت کی نئی صبح پہ چھائی
ﷲ تم اس رات کے پردے کو ہٹا دو
دولت میں رہیں خواجہ و مزدور برابر
افلاس کی لعنت کو زمانے سے مٹا دو
ہے امن کی خواہش اگر اس دارِ کہن میں
انسان اور انسان کی تفریق مٹا دو

پرواز کو اک اور فضا ہوگی میسّر
اس چرخ کہن سال کی بنیاد ہلا دو
"اُٹھو کہ غریبی نہیں تقدیر الٰہی"
اِس نعرے سے دنیا کے غریبوں کو جگا دو
سرکش ہو اگر مادر گیتی سے فلک بھی
قدموں پہ اُسے مادر گیتی کے جھکا دو
اختر یہ کدھر راہ نمائی کو چلے تھے
گُم ہو گئے خود تم ہی کچھ اپنا تو پتا دو

# شکوۂ حُور

سنہ ۱۹۴۰

خدا سے اِس طرح گویا ہوئی اک حورِ جنّت کی
"الٰہی اپنے بندوں پر ہمیشہ تو نے رحمت کی
مگر با صد ادب اک بات مجھ کو عرض کرنی ہے
کہ حالت بارہا اہلِ زمیں کی میں نے دیکھی ہے

دیا مردوں کے ہاتھوں میں زمامِ دہر کو تو نے
پھنسایا مشکلوں میں خود نظامِ دہر کو تو نے
ہمیشہ شور و شر رکھّا ہے عالم میں بپا اس نے
بنا دی ہے بہت مسموم دنیا کی فضا اس نے

---

بہم آویزشیں فرزندِ آدم کی جبلّت ہے
اسے خود سے محبّت اپنے ہم جنسوں سے نفرت ہے
ہمیشہ ہی سے یہ ڈوبا رہا ہے کبر و نخوت میں
غرور و تمکنت داخل ہیں گویا اِس کی فطرت میں
کیا برباد خلقت کو حکومت کے لئے اس نے

بہایا ہے ہمیشہ خون قوت کے لئے اس نے
حقائق پر نظر پڑنے نہیں دیتا غرور اس کا
خود اپنی ذات میں محصور رہتا ہے شعور اس کا
کبھی ہٹتی نہیں ہے مادیت سے نظر اس کی
ہمیشہ زندگی پستی میں ہوتی ہے بسر اس کی

---

رہا ہے ابتدا سے رزم سازی مشغلہ اس کا
ہے دردانگیز عبرتناک خونیں ماجرا اس کا
کیا ہر عہد میں خوں ریزیوں پر اپنی ناز اس نے
ہلاکت پاشیوں میں فخر سمجھا امتیاز اس نے

ستم رانی کی خواہش مرد کی فطرت میں داخل ہے
درندوں کی ہے خواص میں یہ وحشی ہو یہ قاتل ہے
تشدد زیر دستوں پر جو کر سکتے ہیں دنیا میں
وہ بڑھ سکتے ہیں دنیا میں اُبھر سکتے ہیں دنیا میں
رہا ہے اس کا معیارِ ترقی ظلم کی قوّت
نظر آتی رہی شائستگی کے بھیس میں وحشت
کبھی نمرود کی صورت میں دنیا پر ستم ڈھائے
کبھی شدّاد بن کر دل زمانے بھر کے دہلائے
کبھی نکلا یہ صورت میں ہلاکو کی نہاں ہو کر
کیا برباد دنیا کو کبھی چنگیز خاں ہو کر

ہمیشہ رکھتی ہے ہر مرد کو یہ آرزو مضطر
رہوں ہر دوسرے انسان سے ہر چیز میں برتر
بنادے اِس جہاں کو اپنے ہم جنسوں کا اک مرقد
یہی تھا ابتدا سے اُس کی ہر ایجاد کا مقصد
کبھی پتھر کبھی تیر اور کبھی تلوار اور خنجر
کبھی نیزے کبھی بھالے کبھی گرز اور کبھی سنگر
کبھی برباد کیں بندوق سے آبادیاں اس نے
کبھی توپوں سے اپنی پھونک ڈالیں بستیاں اس نے
ترے بندوں پہ برسائی ہے گولوں سے قضا برسوں
مشینوں سے ہلاکت پاشیاں کرتا رہا برسوں

فضائیں ہر طرف زہرِ ہلاہل بھر دیا اس نے
غضب یہ ہے ہواؤں میں موت کو حل کر دیا اس نے
یہ مصنوعی پروں سے اُڑ کے پہنچا آسمانوں پر
قضا برسی وہاں سے زندگی کے گلستانوں پر
بلندی پر پہنچ کر بھی نہ باز آیا یہ سودائی
ستمگر نے زمیں پر آسماں سے آگ برسائی

---

ہو کثرت زر کی، مہلک اسلحہ کی ہو فراوانی
حقیقت میں اسی کا نام ہے تہذیبِ انسانی
عجب پُر لطف شے ہے جس کو یہ تہذیب کہتا ہے

لہو اس کے سبب، اللہ کے بندوں کا بہتا ہے

جہاں میں گو بہ ظاہر کچھ اجالا کر دیا اس نے
مگر باطن کو انسانوں کے کالا کر دیا اس نے

بنایا خوشنما دھوکے کو عیّاری کو حکمت سے
تجارت کو کیا آزاد دنیا میں دیانت سے

تصنّع کا عطا خلعت کیا کردار کو اس نے
ریا سے بھر دیا انسان کے اطوار کو اس نے

بنایا حق کے بندوں کو مشینوں کا غلام اس نے
دیا نوعِ بشر کو مادیت کا پیام اس نے

سجایا جسم کو، کی روح کی تخریب دنیا میں

ہے اک طرفہ تماشہ مرد کی تہذیب دنیا میں

---

نہیں محدود اپنی جنس تک ظلم و ستم اس کا
ہمیشہ ہی رہا حوّا کی بیٹی پر کرم اس کا
ذریعہ اپنی تفریحوں کا سمجھا اس نے عورت کو
بنایا اپنا اک بے بس کھلونا اس نے عورت کو
ہمیشہ ابتدا سے آج تک، ظُلم اُس پہ ڈھایا ہے
کنیز اُس کو بنایا خادمہ اُس کو بنایا ہے
اسے ہر مادی شے کی طرح ملک اپنی سمجھا ہے
کبھی اُس کو خریدا ہے، کبھی ظالم نے بیچا ہے

وہ کہتا ہے کہ عورت ہے جہاں میں عقل سے عاری
ہے اُس کے بس سے باہر اس تمدّن کی گرانباری
اسے لازم ہے پالے قوم کے بچوں کو ماں بن کر
کرے کچھ تربیت اُن کی ہماری ترجماں بن کر

---

تصوّر قومیت کا بھی فساد انگیز ہے بے حد
ہو غلبہ اور انسانوں پہ حاصل، ہے یہی مقصد
یہ جذبہ ہے نتیجہ مرد کی خوں ریز فطرت کا
یہ جذبہ ہے سبب انساں کی نسلوں میں عداوت کا
ہوئی پیدا تمیز رنگ و نسل اس کی عنایت سے

جہاں کو قومیت نے بھر دیا رنج و کدورت سے
تخیل کی اسی جذبے نے کردیں وسعتیں باطل
ہے فوق انسانیت پر قومیت کو آج کل حاصل
یہاں انسان بے حس فردِ قومی کے سوا کیا ہے؟
کہ قوم اک کل ہے اور ہر فرد اُسکا ایک پرزا ہے
ہے مذہب قوم کا حرص اور خودغرضی شعار اس کا
انھیں وصفوں کی اچھی تربیت پر ہے مدار اس کا
کچھ اس صورت میں آزادی کی ہر اک قوم جویا ہے
کہ آزادی کا جیسے صرف اُسی کو حق پہنچتا ہے
بھرا قوموں نے آزادی کا جو بہروپ دنیا میں

غلامی کا یہی ہے سب سے بد تر روپ دنیا میں
ادارے ہیں یہ اُن کے مدرسے بغض و عداوت کے
سبق دیتے ہیں ان میں دوسری قوموں سے نفرت کے
کبھی ڈرتے ہیں قوت سے کبھی پھر خود ڈراتے ہیں
درندوں سے کہیں جیسے درندے پیش آتے ہیں
سبق ہمسایہ ملکوں سے دیا ہے بد گمانی کا
بھرا ہے سر میں سودا بے بسوں پر حکمرانی کا
غرض بینی منظّم ہو کے کھا جاتی ہے قوموں کو
ہمیشہ خوں فشانی پر یہ اکساتی ہے قوموں کو
عجب یہ ہے کہ اپنی قوم سے گر مجھ کو الفت ہو

تو لازم ہے کہ پھر کُل دوسری قوموں سے نفرت ہو

---

ہُوا یہ حال آخر مردِ سرکش کی رعونت کا
کیا اُس نے بلند اکثر علم تیری بغاوت کا
ہُوا گمراہ بے خود ہو کے اتنا خود پرستی سے
کیا انکار اس نے بارہا خود تیری ہستی سے
نہ تھی محدود اس انکار ہی تک سرکشی اس کی
بھیانک پستیوں تک لے گئے پہنچی گمرہی اس کی
مقابل میں ترے لاکھوں خدا اس نے بنائے ہیں
انھیں پوجا ہے ان کی بندگی کے گیت گائے ہیں

ہوا بے چین آخر اس قدر جذبہ بڑائی کا
کیا اعلان اکثر مرد نے اپنی خدائی کا

---

مگر حیرت یہ ہے اے خالق ہر دو جہاں تو بھی
ہمیشہ سے رہا ہے مرد ہی پر مہرباں تو بھی
ہدایت کے لئے خلقت کی تو نے جو نبی بھیجے
تجھے معلوم ہے خود ہی وہ سارے مرد ہی بھیجے
مجھے ہوتی شکایت (میرے منہ میں خاک) کیا اُن سے
مگر اس میں نہیں شک مرد کا رتبہ بڑھا اُن سے
بنا دیتا اگر تو ایک بھی عورت کو پیغمبر

## تو ہوتا مرد کو پھر فوقیت کا حوصلہ کیونکر

---

الٰہی آگیا ہے وقت اب دنیا پہ رحمت کا
بہت ہی حال ابتر ہو گیا ہے تیری خلقت کا
بنایا ابنِ آدم نے تری دنیا کو ویرانہ
بہائم سے بھی بازی لے گیا اب تو یہ دیوانہ
ستمگر نے لباسِ آدمیت چاک کر ڈالا
جو تو نے نعمتیں بخشی تھیں اُن کو خاک کر ڈالا
دلوں کو آتشِ بغض و حسد سے بھر دیا اس نے
تری دنیا کو دوزخ سے بھی بدتر کر دیا اس نے

مٹا ڈالا جہاں سے امن و راحت کا نشاں تک بھی
زمیں پر وہ ستم ڈھائے کہ کانپا آسماں تک بھی
کچھ اس طرح کیا ہے اس نے غارت امنِ عالم کو
کہ رشک آتا ہے دنیا کی فضا پر اب جہنّم کو

---

ہمیشہ تو نے رکھا نظم عالم کا مدار اس پر
کیا ہے اے خدا لاکھوں برس تک اعتبار اس پر
مگر اس نے ہمیشہ امنِ عالم کو کیا غارت
برابر (ابتدا سے آج تک) بڑھتی رہی وحشت
نہ رحم اس میں نہ مہر اس میں نہ خوفِ عاقبت اس کو

نہ پاسِ آدمیت ہے، نہ قدرِ عافیت اس کو

---

الٰہی تیری دنیا کو محبت کی ضرورت ہے
خدا ترسی کی دلسوزی کی دلداری کی حاجت ہے
ہیں ایسی ہستیاں درکار اس کی رہنمائی کو
جو مذہب اپنا سمجھیں نوعِ انساں کی بھلائی کو
جہاں میں ایک مسلک وحدتِ انسان ہو جن کا
اخوّت دین ہو انسانیت ایمان ہو جن کا
جو سمجھیں اس حقیقت کو جہاں کی پاسبانی میں
برابر ہیں حقوقِ انسان کے اس دارِ فانی میں

جو صلح و آشتی امن و سکوں کی برتری سمجھیں
جہاں میں عدل کو اپنا اصولِ زندگی سمجھیں
نہ آئے فرق کرنا جن کو ادنیٰ اور اعلیٰ میں
جو ڈھونڈیں گم شدہ انسانیت کو دل کی دنیا کو
جو دنیا سے مٹا ڈالیں غرور و کبر و نخوت کو
جو اپنے خُلق سے توڑیں طلسمِ زور و قوت کو

---

یہ سب اوصاف پیدا کر دیئے ہیں تو نے عورت میں
کچھ اِن سے بھی سوا گن بھر دیئے ہیں تو نے عورت میں
خمیر اس کا بنا ہے درد و سوز و مہر و اُلفت سے

بھرا ہے اس کے دل کو اے خدا تو نے محبت سے

اسے ایثار و قربانی کی دولت تو نے بخشی ہے

جو خدمت سے ملا کرتی ہے وہ عظمت عطا کی ہے

ہے اس کی زندگی کا حسن خوش خلقی، خوش اطواری

ہے شیوہ اس کا ہمدردی، ہے مسلک اس کا غمخواری

ہے اب تک نور سے جنّت کے روشن اس کی پیشانی

ہیں اطوار اس کے قدوسی ہیں اوصاف اس کے ربانی

ابھی تک عالم خاکی میں جو امن و مسرت ہے

وہ دنیا جانتی ہے صرف عورت کی بدولت ہے

الٰہی اب مٹا دے اس جہاں سے ظلم و سفّا کی
سپرد عورت کے کر دے انتظام عالمِ خاکی
کرے گی مادی دنیا میں بھی روحانیت پیدا
دلوں میں ہو گی انسانوں کے پھر انسانیت پیدا
گزارے گا کوئی کیوں زندگی پھر رنج و کلفت میں
محبت ہی محبت ہو گی عورت کی حکومت میں
حسد کو اور خود غرضی کو دنیا سے مٹا دے گی
یہ اِس اجڑی ہوئی بستی کو اک جنّت بنا دے گی



# جوابِ شکوۂ حور

یہ شکوہ کر چکی جب حورِ جنّت ربِ اکرم سے
تو اک آواز آئی بارگاہِ عرشِ اعظم سے

کہ اے معصوم بھولی حور تجھ کو جو شکایت ہے
زمیں کے حال سے ناواقفیت کی بدولت ہے

ابھی شاید نہیں سمجھا ہے تو نے اِس حقیقت کو
دیئے ہیں مختلف اوصاف ہم نے مرد و عورت کو

وہ ہے تخلیق کا اعجاز کہتے ہیں زمیں جس کو
وہ ہے اک رازِ اندر راز کہتے ہیں زمیں جس کو

عطا کی ہم نے جُرأت جستجو کی ابنِ آدم کو
کہ وہ افشا کرے اسرارِ موجوداتِ عالم کو
خمیر اُس کا اٹھایا امتزاجِ سنگ و آہن سے
کیا پھر آشنا کانٹوں کو ہم نے اُس کے دامن سے
لہو کو جوش بخشا سعی و کاوش کی حرارت سے
جبیں کو اس کی روشن کر دیا نورِ شجاعت سے
عطا کی طبعِ سیل و ہمّت کوہِ گراں اُس کو
پھر ہم نے بخش دی تاب و تبِ برقِ تپاں اُس کو
کیا احساس پیدا اُس میں پھر دفعِ مضرّت کا
لگایا اُس کے دل کو ہم نے چسکا علم و حکمت کا

تمیز نیک و بد دے کر اسے محنت ا ٹھرایا
دو راہا خیر و شر کا اُس نے اپنے سامنے پایا
وہ افشا کر رہا ہے مدتوں سے راز فطرت کے
خزانے کھل رہے ہیں رفتہ رفتہ علم و حکمت کے

---

یہ سچ ہے مرد ایسے بھی رہے ہیں ہر زمانے میں
مزا آتا ہے جن کو نسلِ انسان کے مٹانے میں
وہ آنکھیں بند کر کے راستے پر شر کے چلتے ہیں
وہ اپنے بھائیوں کا خون پی پی کر ہی پلتے ہیں
زمیں کو بارہا وحشی درندوں نے اجاڑا ہے

غرور و کبر و نخوت نے دماغوں کو بگاڑا ہے
جو اوروں کے لئے کھودی تھی کھائی خود گرے اس میں
جو سلگائی تھی آگ اوروں کی خاطر خود جلے اس میں
خود ان کی کجروی نے آخرش غارت کیا ان کو
نتیجہ ان کی بد اعمالیوں کا یہ ملا ان کو
ذلیل و خوار دنیا میں رہے ہیں سب یہ بد اختر
خلف ان کے ابھی تک بھیجتے ہیں لعنتیں ان پر
اسی طرح اتر جاتا ہے نشۂ کبر و نخوت کا
ہمیشہ سے یہی قانون ہے دنیا میں قدرت کا

---

تجھے شکوہ ہے عورت کو نہ بخشی میں نے سلطانی
نہ سونپی صنفِ نازک کو کبھی میں نے جہاں بانی
نہ عورت کو بنایا ہے کبھی پیغامبر میں نے
نظامِ دہر کو خود ہی کیا زیر و زبر میں نے
تو واقف ہی نہیں ہے اصل میں عورت کی فطرت سے
دیے ہیں اس کو چند اوصاف ہم نے اپنی قدرت سے
وفا میں ہم نے اس کی صنف کو کامل بنایا ہے
حقیقت میں اسے انسانیت کا دل بنایا ہے
منوّر اس کی آنکھوں کو کیا ہے ہم نے عصمت سے
خمیر اس کا حقیقت میں بنایا ہے محبّت سے

اسی کے دم سے ہے جو کچھ ہے رونق بزمِ ہستی کی
وہی تو جان ہے در اصل انسانوں کی بستی کی

مروت اور محبت ہر طرف ہے اس کی دنیا میں
رواں شرم و حیا ہے خون بن کر اسکے اعضا میں

بنایا راہبر صدق و صفا کو مہر و الفت کو
بھرا ہے ہم نے سوز و ساز سے اس کی طبیعت کو

وہ نغمہ ہے مجسّم روحِ موسیقی سراسر ہے
جہانِ مضطرب میں وہ سکونِ روح پرور ہے

یہ اوصاف اس لئے عورت کو بخشے ہیں حقیقت میں
مدد دے مرد کو وہ انکشافِ رازِ قدرت میں

بھلا حیرت نہ ہوگی کس کو تیری اس شکایت سے
کہ ہے محروم عورت کیوں جہانبانی کی دولت سے
کریں گی کام کرنیں چاند کی کیونکر کدالوں کا
لیا جائے گا کیونکر برگِ گل سے کام ڈھالوں کا
نسیمِ صبح کیا انجام دے گی کام صرصر کا
شرر کیونکر بنایا جائے گا رنگِ گلِ تر کا
تیرِ دشت کو ہوگی طراوت صحنِ گلشن کی
جگہ پائے گی کیا کلیوں میں سختی سنگ و آہن کی
گراں گزرے گی طبعِ نرم پر کاوش حکومت کی
سیاست پل سکے گی گود میں کیونکر محبت کی

ہے اس کے واسطے بہتر جہا بانی سے محرومی
عطا ہم نے اسے دنیا میں کی ہے گھر کی مخدومی
یہ کیا کم ہے بنایا ہے اسے مردوں کی ماں ہم نے
رکھا ہے اس کے قدموں کے تلے باغِ جناں ہم نے
اُسے عزت عطا کی ہے اسے حرمت عطا کی ہے
اُسے عفت عطا کی ہے اسے عصمت عطا کی ہے
ہمارے ہر نبی نے اُس کو ماں کہہ کر پکارا ہے
اسی کی گود میں ہنس کھیل کر بچپن گزارا ہے

---

نظامِ دہر اب بھی اس کے ہاتھوں میں ہے اے نادا

کہ گودی میں اسی کی تربیت پاتا ہے ہر انساں
سدھائے جائیں بچّے امنِ عالم پر نظر رکھ کر
تو پیدا ہی نہ ہونے پائیں پھر دنیا میں غارت گر
وہ امن و عافیت کے درس بچّوں کو اگر دے گی
تو ظلم و جور و نفرت سے جہاں کو پاک کر دے گی
ضیا نکلے گی اس کی تربیت سے جاں نثاری کی
جہاں سے دور کر دے گی غرض مندی کی تاریکی



# گلبانگ

بازگلبانگِ پریشاں می زنم
آتش اندر عندلیباں می زنم

عرفی

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |

# صبح کا تارا اور شبنم

۱۹۳۱ء

صبح کے تارے نے دیکھا غور سے سوئے زمیں
رات کے دامن میں پنہاں تھا ابھی روئے زمیں
تھی ابھی تک زندگی آسودۂ خوابِ سحر
نور سے ناآشنا اب تک تھی محرابِ سحر

غفلتوں نے دامنِ شب کو ابھی چھوڑا نہ تھا
پہلوئے امروز سے فردا ابھی نکلا نہ تھا
آخر اک گلزار کی جانب ہوا اُس کا گزر
کچھ رکا وہ پھول کے دامن پہ شبنم دیکھ کر
دیکھی ہر قطرے کے اندر اپنی صورت کی جھلک
اتنی روشن دل نہ تھی، شے کوئی بروئے فلک
پہلے تو حیرت سے اس منظر کو وہ دیکھا کیا
پھر یہ ذرّے نے اک شبنم کے قطرے سے کہا
"کون ہے تو یہ بتا دے مجھ کو اے میرے رفیق!
اے دُرِ ناسفتۂ تسنیم، اے نورِ رقیق

کتنا دل آویز و دلکش کس قدر پیارا ہے تو
کیا مرا ہم جنس اک سیّال سا تارا ہے تو
یا عرق ہے یاسمیں کے روئے پاکیزہ کا تو
یا گرہ بن کر، کرن ہے چاندنی، یہ رو بہ رو
یا کسی جرمِ فلک کا خوشنما ٹکڑا ہے تو
چاندنی آنکھوں سے آنسو بن کے یا ٹپکا ہے تو
حور موتی اپنے زیور کا کہیں لائی نہ ہو
چاندنی ننھے سے کوزے میں سمٹ آئی نہ ہو
عکس نوریں یا فرشتہ کی عبادت کا ہے تو
کان کا جنت کی یا کچّا سا اک ہیرا ہے تو

راز ہے یا تو سحر کے دیدۂ نمناک کا
یا پسینہ ہے فرشتے کی جبینِ پاک کا
یا دلِ روشن ضمیرِ گلستاں کہئے تجھے
راز کھل جائے گا ورنہ لامکاں کہیئے تجھے
کیا بتاؤں میں نہیں ہے میری قسمت میں قیام
ورنہ صورت کو تری دیکھا ہی کرتا صبح و شام

---

سُن کے یہ شبنم کے قطرے نے دیا اُس کو جواب
اے ضیائے چشمِ شب اے رکنِ بزمِ ماہتاب
کس طرح روشن کروں یہ راز تجھ پر کیا ہوں میں

رات کی آنکھوں کا جو آنسو ہے وہ قطرہ ہوں میں
ہوں میں اپنی مختصر ہستی کے آگے آب آب
زندگی کی اک جھلک، زود ہوا کا اک حباب
گونج ہوں میں چاندنی کے نغمۂ خاموش کی
اک جھپک سی ہوں میں چشمِ نیم بازِ دوش کی
آ بتا دوں راز اپنے حسن اپنی آب کا
ایک ہلکا سا تصوّر ہوں سحر کے خواب کا
ختم ہونے ہی کو ہے اب میری ہستی کی بہار
پل میں ہو جاؤں گا میں خورشیدِ خاور پر نثار

---

صبح کے تارے نے حیرت سے کہا سن کر یہ بات
اِس قدر تجھ میں لطافت، مختصر اتنی حیات
یہ عجب دستور کچھ اس خاک کی بستی کا ہے
ہستیِ پستی ہے کیا، اک کھیل یہ ہستی کا ہے
کہتے ہیں سورج کی کرنوں میں نہاں ہے زندگی
دہر میں اس کے کرم سے ضو فشاں ہے زندگی
اس کی آمد جب حیاتِ نو کی اک تمہید ہے
پھر پیامِ موت کیوں تیرے لئے خورشید ہے
آسمانوں پر نہیں رائج ہے یہ آئین کہیں
عالمِ بالا میں عمریں وقت سے بنتی نہیں

رونقِ بزمِ جہاں تجھ سے ہے اے جانِ بہار
تیری ہستی ہے جہاں میں حسن کی سرمایہ دار
قدرداں لیکن ترے دارِ فنا میں ہیں کہاں
تیرے لائق ہی نہیں ہے اصل میں یہ خاکداں
آ مرے ہمراہ چل اِس عالمِ فانی سے دور
دور اس خورشیدِ خاور کی جہانبانی سے دور
پھر سدا زندہ رہے گا عالمِ بالا میں تو
نور کا گھر پائے گا اُس نور کی دنیا میں تو

---

ہنس کے تارے سے کہا شبنم نے سن اے خوبرو

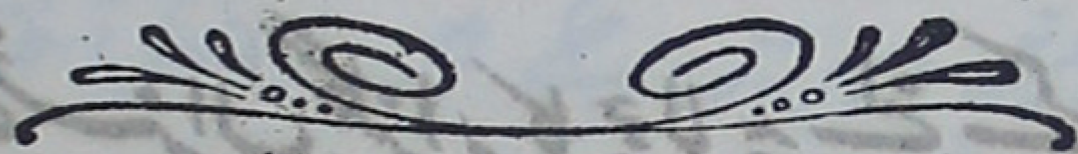
کس قدر اِس خاک کی بستی سے بیگانہ ہے تو
رازِ اِس دنیا کی رونق کا ہے پیہم انقلاب
بخشتا ہے حُسن، عالم کو تغیّر کا نقاب
بے ثباتی ہی سے قائم ہے سرورِ زندگی
ظلمتِ تغیّر ہے ضوگیرِ نورِ زندگی
جدّت اس دنیائے آب و رنگ کی فطرت میں ہے
سچ یہ ہے کہتے ہیں جس کو زندگی جدّت میں ہے
وہ ہمیشہ دہر میں چمکے ہیں بنکر آفتاب
جن کے ہاتھوں سے یہاں برپا ہوئے ہیں انقلاب

جو زمیں کی زندگی کے راز سے آگاہ ہیں

وہ سکوں ناآشنا ہیں وہ تغیر خواہ ہیں
وہ اُٹھا دیتے ہیں موجودات کے رُخ سے نقاب
مادے کی صورتوں میں کر رہے ہیں انقلاب
ہے زمیں کی تازگی تجدید میں جلوہ فشاں
دہر کی رنگینیاں نیرنگیوں میں ہیں نہاں
زندگی پر جب کبھی یک رنگیاں چھانے لگیں
گلشنِ ہستی میں جو کلیاں تھیں مرجھانے لگیں
ہے خزاں گلزار کا چولا بدلنے کے لئے
پھول مرجھاتے ہیں کلیوں کے نکلنے کے لئے
یہ تغیر عالمِ بالا پہ گر معدوم ہے

تب وہ عالم زندگی کے درد سے محروم ہے
زندگی سے گر وہاں کے لوگ اکتاتے نہیں
پھر تعجب ہے کہ وہ بے موت مرجاتے نہیں
تیری اُس دنیا میں گر جینا ہی جینا ہے مدام
تو ہمیں سے ہیں ادب کے ساتھ کرتا ہوں سلام

---



# بہار

پھر بہار آئی ہوائے خوشگوار آنے لگی
پھر کوئی شے چپکے چپکے دل کو اُکسانے لگی
پھر گلوں کے دل میں کچھ شعلے سے بھڑکانے لگی
پھر چمن کی ہر روش پر آگ دہکانے لگی

تاک کی بیلوں میں جب پہنچی تو بل کھانے لگی
تاک کی بیلوں سے جب نکلی تو لہرانے لگی
پھر ہواؤں کو ہری شاخوں میں اُلجھانے لگی
پھر چمن میں زلفِ سنبل کی سلجھانے لگی
پھر ہنسی بن کر لبوں پر پھول کے چھانے لگی
پھر خوشی بن کر کلی کے دل میں لہرانے لگی
پھر پھلوں میں روٹھ کر بیٹھی بہ اندازِ لطیف
پتّیوں کے جھانج سے پھر دل کو بہلانے لگی
پھر نچھاور کی گلوں پر لعلِ رمّانی کی چھوٹ
پھر زمرّد کر کے حل سبزے پہ پھیلانے لگی

ڈگمگائی پھر چٹانوں کی بلندی دیکھ کر
پھر سنبھل کر آئینہ تدّی کو دکھلانے لگی
چھپ گئی نے بن کے کوئل کے رسیلے راگ میں
آم کی کلیوں پہ خوشبو بن کے لہرانے لگی
پھر ہوئی جھنکار سی پیدا وہ دل کے تار میں
پھر وہ چرواہے کے نغموں کی صدا آنے لگی
چھپ کے نکلی پھر چمن سے گل بداماں شاد شاد
بستیوں پر پھر چمن کا عطر برسانے لگی
ذرّے ذرّے کو مسرت کی جھلک سے بھر دیا
ذرّے ذرّے میں مسرت کی جھلک پانے لگی

پھر چھیڑے خاموش نغمے پھر رچی خاموش بزم
پھر ہر اک شے اس جہاں کی ناچنے گانے لگی
اُس طرف بوڑھوں کی باتوں کو بنایا جاندار
اِس طرف بچّوں کو جست و خیز سکھلانے لگی
آ گئیں پھر نوجوانوں کی اُمنگیں جوش پر
چال اُن کی اِس زمیں کے دل کو دہلانے لگی
جب وہ خود آگاہ نکلے جھومتے مستانہ وار
ساری دنیا اُن کے قدموں میں نظر آنے لگی
کر دیا مسرور یکساں خواجہ و مزدور کو
اک طلسم رنگ و بو سے وجد میں لانے لگی

جب لکھی افسر نے اس پر ایک البیلی سی نظم
خوش ہوئی اتنی کہ ہر مصرعہ پہ اترانے لگی



# نسیمِ سحر

سنہ ۱۹۳۹ء

ہنگامِ صبح ناز سے بادِ صبا چلی
ہر چار سمت باغ میں کلیاں کھلا چلی

جس پھول کے قریب سے گذری ہنسا چلی
سبزہ جو خواب میں تھا اُسے بھی جگا چلی

کلیوں سے چھیڑ کرتی چلی گدگدا چلی
ہر گل سے کھیلتی ہوئی با صد ادا چلی

پودوں نے گود میں جو لیا تو لپٹ گئی

شرمائی اور لجائی، کٹی اور سمٹ گئی

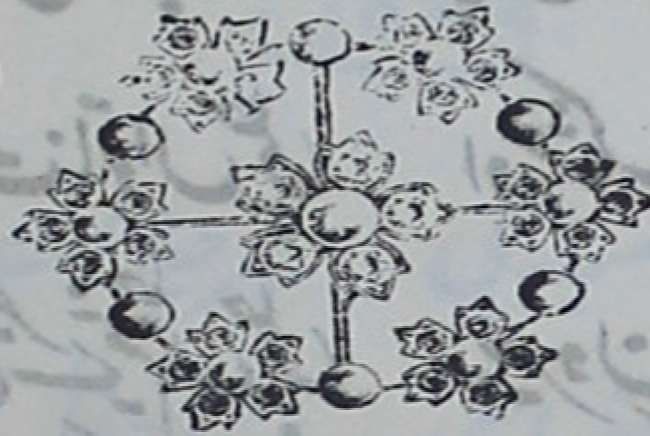
اک سانس لے کے پھر روشوں سے گذر چلی
بے خوف بے ہراس چلی بے خطر چلی
دامن ہزار طرح کی خوشبو سے بھر چلی
شبنم سے چھو کے بھیگ گئی تر بتر چلی
غنچوں کو چھیڑ چھیڑ کے شرمندہ کر چلی
کس ڈھنگ سے چمن میں نسیم سحر چلی

اِک کنج میں جو پہنچی تو چکرا کے رہ گئی
بل تو بہت سے کھائے پہ بل کھا کے رہ گئی

پھر کنج سے نکل کے بہت ناتواں چلی
اور خشک پتیوں کا لئے کارواں چلی
کچھ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرے نیم جاں چلی
بیرونِ باغ صورتِ عمرِ رواں چلی
خاک اس قدر اُڑائی کہ بہت ہی گراں چلی
یہ کون جانتا ہے چمن سے کہاں چلی

افسرِ صبا ہر ایک کو مسرور کر گئی

# کیفیتوں سے رُوح کو معمور کر گئی



# چاندنی رات

سنہ ۱۹۳۸ء

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی
چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر
منتشر ہے چاندنی کے فرش پر

کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں
جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے
حُسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے
نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
یہ سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال
یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے
بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اس کے دم سے ہے
اور محبّت اِس کو افسر ہم سے ہے



# طلوعِ سحر

وہ صبح ہوئی پردہ سا ہٹا قدرت کے رُخِ زیبا سے
وہ چھوٹے شیرِ سحر نکلی کچھ کہہ کے شب کی لیلا سے
پھر دن نے آنکھیں کھولی ہیں بستر پر چاندی سونے کے
پھر سورج نے انگڑائی لی پردوں میں لال بچھونے کے

وہ نور کی گنگا نکلی ہے یا پھر شب کی جٹا سے مشرق میں
یا رنگ اڑا ہے لال بہت پھولوں کی سہلو کی سے مشرق میں
سورج کی زرّیں کرنوں کا یہ قافلۂ شاہانہ ہے
یا شب کی کالی زلفوں کا یہ ایک سنہری شانہ ہے
یہ مہرِ منوّر کا چہرہ لپٹا ہے شفق کی چادر میں
یا اشرفی ایک ٹری سی ہے، جو پڑی ہے آگ کے ساگر میں
یا رات کے پربت سے نکلا پگھلے ہوئے سونے کا جھرنا
یا دن کی سنہری گگری کو تاروں کے خون سے ہے بھرنا
یا آج ہوا ہے راز افشا سمے کے مال خزانے کا
یا در یہ کسی نے کھول دیا خاور کے عبادت خانے کا

وہ صبح ہوئی وہ جاگ اُٹھی پھر میرے دل کی دنیا بھی
کہتے ہیں جسے مہر تاباں شاید وہی خود ہے مسیحا بھی
دنیا کے چپّے چپّے میں وہ زندگی لہریں لینے لگی
گلزار میں کھل کے ہر ایک کلی پیغام سحر کا دینے لگی
وہ راگ پرندوں نے چھیڑا سورج کی کرن کے تاروں پر
وہ بالیں کھیتوں میں ناچیں اِن جادوگر کے اشاروں پر
پرواز کی طاقت آنے لگی شبنم کے بے حس دانوں میں
سونے کو چھپا کر رکھ نہ سکے گلزار زمیں کے خزانوں میں
دامن میں لیا ہر پتّی نے بڑھ بڑھ کے نمو کی دولت کو
پھولوں نے اڑایا ہنس ہنس کر کرنوں سے خوشی کو مسرت کو

سرشار ہُوا ذرّہ ذرّہ انوار کی بارش ہونے لگی
اک ذرّے ہی کیا تھے رقص کناں ہر چیز کو گردش ہونے لگی
بیداری کے نغمے وقتِ سحر لہراتے ہیں دل کی دنیا میں
سورج سے حیاتِ نو کا اثر ہم پاتے ہیں دل کی دنیا میں

---

وہ صبح ہوئی وہ جاگ اُٹھی پھر میرے دل کی دنیا بھی
پھر دل میں اُمنگیں اُٹھنے لگیں جذبات کا اُمڈا دھارا بھی
پھر آرزوئیں بیدار ہوئیں پھر حوصلے دل میں اُبھرنے لگے
خوابیدہ امیدیں جاگ اُٹھیں ارمانوں کے چہرے نکھرنے لگے
صہبائے حیات کی موجوں سے سورج کا جام چھلکنے لگا

کچھ ایسا جھنجوڑا سورج نے دل ہر ذرے کا دھڑکنے لگا
بھر دی ہے لہو میں حرارت سی، بجلی سی رگوں میں دوڑا دی
ہر شاخ چمن میں جھوم گئی، کتنی نمو کی برسا دی
کہتے ہیں جسے مہر تاباں وہ نور حیات کے جلوے ہیں
وسعت کے مطابق یہ جلوے دامن میں سب نے سمیٹے ہیں
دل وہ ہے جو سورج بن جائے جو ہر دل کو روشن کر دے
جو پتھر کو ہیرا کر دے، جو مٹی کو کندن کر دے
زندہ رہو مثل مہر، اگر خواہش ہے زندہ رہنے کی
بن جاؤ گے پھر کیا اے افسر، یہ بات نہیں ہے کہنے کی

# راہِ دگر

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود

لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# سرودِ ازلی

۱۹۵۰ء

ساحلِ بحر نگاہوں سے نہاں آج بھی ہے
موج بیتاب سرِ آبِ رواں آج بھی ہے

زہد ہے بے خبرِ حسنِ جہاں تابِ حیات
کششِ جلوۂ حورانِ جناں آج بھی ہے

ایک ذرّہ بھی کہیں نور سے محروم نہ ہو
چشمِ خورشید بہ ہر سو نگراں آج بھی ہے

ناز ہے شیخ کو جس راز کی آگاہی پر
وہ ہمیشہ کی طرح سِرِّ نہاں آج بھی ہے

ٹھوکریں سیکڑوں ہر گام پہ کھائی ہیں جہاں
اُسی رستے پہ جہانِ گزراں آج بھی ہے

بے نیازی کی ادا حسن میں اب بھی ہے وہی
عشق سرگشتہ و رسوائے جہاں آج بھی ہے

ذوق خود بے خبر سوزِ دروں ہے تیرا
بوئے خوش دل میں لئے عنبرِ وباں آج بھی ہے

گو ہیں تہذیب و ترقی کی بہاریں ہر سو
پتّے پتّے میں نہاں فصلِ خزاں آج بھی ہے
زندگی گو ابدی ہے مگر اپنے ہاتھوں
زندگی کارگہِ شیشہ گراں آج بھی ہے
ہے وہ محروم اگر کیفِ عبادت سے تو کیا
ہر مسلمان کے گھر میں رمضاں آج بھی ہے
رکھ سکی ربط نہ تہذیب زبان و دل میں
سِرِّ دلبر بہ حدیثِ دگراں آج بھی ہے
عشق کی جیب میں اک تار بھی موجود نہیں
عقل سود از دہ سود و زیاں آج بھی ہے

فوقیت آج تک انسان کو انسان پہ ہے
ہوسِ خواجگیِ کون و مکاں آج بھی ہے
کیوں کوئی منتظرِ حشر رہے اے افسرؔ
ذرّے ذرّے میں قیامت سی نہاں آج بھی ہے



# نوائے خرد

سنہ ۱۹۴۷ء

یہ ایک دیوانہ کہہ رہا تھا بہ صدا دائے قلندرانہ
اگر میسّر ہے سوزِ پنہاں تو پھونک دے اپنا آشیانہ
تجھے خبر ہی نہیں ہے غافل، یہ اقتضا ذوقِ فقر کا ہے
کہ راس آیا نہ راس آئے گا تجھ کو اندازِ خسروانہ

تجھے یاد نہیں جہاں کی تو محوِ ذکرِ وطن ہے غافل
سکون اس کا ہے خواب آور سنا نہ دے تجھ کو یہ فسانہ
خرد کی محفل اجاڑ سی ہے نظر کی دنیا ہے سونی سونی
عزیز من ہو گیا ہے اہلِ جنوں سے خالی ترا زمانہ
تحمّلِ نفس کی ضرورت ہے ضبطِ جذبات کا محل ہے
سنبھل کہ تہذیبِ عہدِ نو کے بہت ہیں انداز دلبرانہ
کیا ہے محدود خود کو تو نے جہانِ خاکی کی وسعتوں میں
وہ مرغ ہو جا کہ شاخِ طوبیٰ پہ بھی بنائے نہ آشیانہ
یہاں کے سود و زیاں کا قصہ وہاں کے سود و زیاں کا چرچا
ہے موت بھی تیری تاجرانہ حیات بھی تیری تاجرانہ

کوئی حقیقت سمجھ کے خوش ہے کوئی فسانہ سمجھ کے چپ ہے

جو مجھ سے پوچھو تو اصل یہ ہے، نہ یہ حقیقت نہ وہ فسانہ

جہانِ فانی کی زندگی کا نہ بھول جانا یہ راز افسر

شرر محبت کا ہو جو روشن تو سوز ہے تیرا جاودانہ

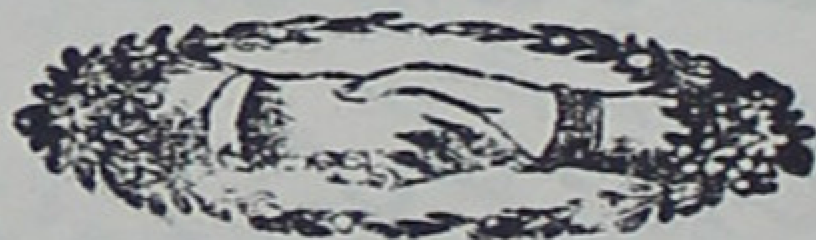


# سُوزِ ناتمام

سنہ ۱۹۳۰ء

الٰہی آج یہ کیا ہو گیا زمانے کو
کہ ہے گناہ وسیع الخیال ہونا بھی
خزاں کمیں میں ہے گلچیں ہے تاک میں شب و رُوز
غضب ہے باغ میں پھولوں کی ڈال ہونا بھی

جو چوٹیوں پہ ہے وہ گھاٹیوں سے گزرا ہے
کمال کی ہے علامت زوال ہونا بھی
نہ شکوہ سنج مرا جوشِ سعی ہو کیونکر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی
دلِ برشتہ کی وہ خاک ہوں میں اے اختر
نہ آیا جس کو کبھی پائمال ہونا بھی



# نوادرِ فکر

سنہ ۱۹۵۰ء

کبھی رستے سے بھٹکا جب حقائق کا تماشائی
تو ہر ذرّے کے دل میں اک قیامت سی نظر آئی
تجھے انبوہِ مردم میں گیا گم تیری غفلت نے
عطا کی تھی تجھے اے بیخبر قدرت نے یکتائی

سما جائے سبو میں تیرے قلزم تو اگر چاہے
نہ ہو گر آبِ جیحوں میں نہیں ہے اب وہ گیرائی

غضب ہے تو نہیں واقف خود اپنے سوزِ باطن سے
بھڑکتا ہے جو تیرے دل میں وہ شعلہ ہے سینائی

جو اپنے نور سے مانندِ شمعِ بزم روشن ہیں
میسر ان کو ہوتی ہے بھری محفل میں تنہائی

یہ جذبِ الفتِ خورشید کی تاثیر تو دیکھو
زمیں کے واسطے اک ہار تاروں کا بنا لائی

پھریرا لہلہاتا ہے وہاں میرے خیالوں کا
جہاں قوسِ قُزح لیتی ہوئی نکلی ہے انگڑائی

حقیقت کیا بتاؤں ہستیِ عالم کی میں تجھ کو
مجسّم ہے جہاں کی شکل میں آدم کی رسوائی

فضاؤں میں بھڑک اُٹھتے ہیں آب و رنگ کے شعلے
جہاں میں جب کبھی ہوتا ہے پیدا ایک سودائی

مئے عیش و مسرت کی توقّع اس سے کیا ہوتی
مرے جامِ تہی کا عکس ہے یہ چرخِ مینائی

حقیقت کی بصیرت دی گئی تھی تجھ کو اے افسرؔ
رہی محدود پھر کیوں مادے تک تیری بینائی

# رموزِ حیات

سنہ ۱۹۳۰ء

عمل کی جن میں ہے قوّت انھیں ملتی ہیں تاثیریں
نمایاں ہو حیاتِ نو اگر ذرّے کا دل چیریں
تڑپ ہو درد کی اب بھی اگر پیدا کسی دل میں
تو لب ہوں آشنا آہوں سے آہوں میں ہوں تاثیریں

نتیجہ ہوتے ہیں محویتِ فکر و عمل کا جو
ہمیشہ سچ ہوا کرتی ہیں اُن خوابوں کی تعبیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں
طلب ہو زندگی کی تو سکوں نا آشنا ہو جا
کہ لفظوں میں نہیں ہوتی ہیں ان باتوں کی تفسیریں



# نوش و نیش

سنہ ۱۹۵۲ء

ہجر کی راتیں ہوئی جاتی ہیں طولانی بہت
زلف کی بڑھتی چلی ہے اب پریشانی بہت
مل نہیں سکتا ہے آدم کا سا کیفِ اضطراب
گو فرشتوں کو میسّر ہے تن آسانی بہت

پھر کوئی موسیٰ کہیں بیتابِ نظّارہ ہے کیا
دل کی دنیا میں ہے پھر جلووں کی طغیانی بہت

اُٹھ گیا انسان کی نظروں سے محنت کا وقار
بخش دی تہذیبِ حاضر نے تن آسانی بہت

کچھ کہیں ہیں، کچھ کہیں ہیں، کچھ کہیں ہیں، کچھ کہیں
مجھ کو ہے مرغوب تاروں کی یہ پاشانی بہت

رہ گیا مایوس ہو کر تو ہی اے نادان خود
ہیں خزف ریزوں میں اب بھی لعلِ رمّانی بہت

اب اُٹھا ہی چاہتا ہے ہوش کے رُخ سے نقاب
بھر چکی ہے عقل کا بہروپ نادانی بہت

گامزن صدیوں سے ہے گو جادۂ تہذیب پر
دور ہے انسانیت سے نوعِ انسانی بہت

ہیں یہ سب تہذیبِ حاضر کی کرم فرمائیاں
ہو گیا ہے آج ارزاں خونِ انسانی بہت

کس سے پوچھیں چھپ گئی زندہ دلی جاکر کہاں
بستیوں پر ہے مسلّط آج ویرانی بہت

لے کے نکلے ہیں سرِ بازار سوکھی ہڈیاں
فاقہ مستوں کو ہوا ہے شوق عریانی بہت

آئیے اب خود کو بھی محنت سے کرلیں آشنا
ہو چکی مزدور کی افسر ثنا خوانی بہت

# شرحِ اسرار

۱۹۳۱ء

نظر کو وسعتیں حاصل نہ ہونگی دوربینوں سے
خدا تک ہو نہیں سکتی رسائی اِن مشینوں سے
کِسے کہتے ہیں دریا یہ خس و خاشاک کیا جانیں
حقیقت کا پتہ شاید ملے کچھ تہ نشینوں سے

ریا سے واسطہ کیا تھا عرب کے اُس زمانے کو
جو ہم ہوتے تو گِر سکتے نہ تھے بُت آستینوں سے
عبادت کے لئے بھی اب ضرورت ہے مشینوں کی
گئے وہ دن ہُوا کرتے تھے جب سجدے جبینوں سے
وہی عہدِ عمل میں بر سرِ منزل بھی پہنچیں گے
پسینہ بن کے جن کا خون نکلے گا جبینوں سے
عجب نیرنگیاں پائیگا افسر نور و ظلمت کی
نکالے کاش سینے چیر کر دل کوئی سینوں سے



# اِشارے

سنہ ۱۹۴۲ء

(۱)

جہاں میں رواں زندگی کے ہیں دھارے
بڑھے جاؤ آگے ہیں ان کے اشارے
چلے ہیں یہاں خود جو اپنے سہارے
سلامت رہے وہ کنارے کنارے

(۲)

یہ مانا بھنور سے نکلنا ہے مشکل
ہے ہر قطرہ دریا کا طوفان در دل
کہیں تو نظر آ ہی جائے گا ساحل
کبھی لگ ہی جائیں گے ہم بھی کنارے

(۳)

یہ ہیں اِس نظامِ تمدّن کے جلوے
تجھے فخر جس پر ہمیشہ رہا ہے
جو محنت سے کھیتوں کو بھرپور کر دے
وہی دانے دانے کو دامن پسارے

(۴)

وہ گل تازہ ہوں گے جو مرجھا گئے ہیں
چھٹیں گے وہ بادل بھی جو چھا گئے ہیں
سلجھیں گے گیسو جو بل کھا گئے ہیں
بہار آرہی ہے خزاں کے سہارے

(۵)

یہ کہتا ہے بات ہوش کی اک جنونی
نہ ہرگز سمجھنا اسے بدشگونی
یہ بزمِ فلک اِس سے ہوگی نہ سونی
اگر ٹوٹ جائیں گے دو چار تارے

(۶)

ہے خطرے میں منجھدار کے ناؤ جن کی
خدا جانے کیا جان پر اُن کی بیتی
کھڑے ہیں لئے ہم تو کشتی کو اپنی
کبھی اِس کنارے کبھی اُس کنارے

(۷)

ابھی تو بہت دُور ہے تم کو چلنا
ہے پُرپیچ راہوں سے ہوکر نکلنا
سنبھل کر ہے گرنا، ہے گر کر سنبھلنا
کہاں تک چلو گے کسی کے سہارے

(۸)

وہ ہیبت ہماری اگر دیدنی تھی
تو عبرت کے قابل ہے یہ بے بسی بھی
کبھی جو برستے تھے آنکھوں سے اپنی
نکلتے ہیں آہوں سے اب وہ شرارے

(۹)

ٹھہرتا نہیں زندگی کا سفینہ
یہی اس جہاں کا ہے افسر قرینہ
ہے بے تاب و بے چین رہنا ہی جینا
یہ ہر لحظہ کرتی ہیں موجیں اشارے

# رمز کی باتیں

۱۹۴۸ء

یہ عالم اور اُس کی فضائیں کیا آنکھوں میں سمائیں گی
اک دن دیکھو گے یہ نگاہیں عرش سے جا ٹکرائیں گی
ڈر کیسا، ہتا ریکیاں شب کی گھِر گھِر کر جب آئیں گی
میرے اِس مٹّی کے دیے میں سُورج کے گُن پائیں گی

تو اے بھولے بھٹکے راہی اُٹھ کے کمر تو کس پہلے
یہ ہی ٹیڑھی میڑھی راہیں خود رہبر بن جائیں گی
شمعیں جو روشن نہیں ہونگی دل کے سوز سے دنیا میں
دھیمی، اور بھی دھیمی ہونگی، آخر کو بجھ جائیں گی
اُمیدوں کے چاند کی کرنیں کیف آور تو ہیں لیکن
دل کے سمندر میں یہ کرنیں پھر طوفان اُٹھائیں گی

فطرت سے ہم ساز نہ ہو تو بہار خزاں سے بدتر ہے
ٹھیک فضا کو پائیں گی تو کلیاں سب کھل جائیں گی
بادل سے ڈر جانے والے، تند ہوا کا ساتھ تو دے
یہ مانا سورج کی شعائیں بادل میں چھپ جائیں گی

رخ سے یہ کہتے ہوئے نکلے میری کٹی کے چھینٹے ہیں
اور ابھی چھائیں گے بادل اور گھٹائیں آئیں گی
کیف آور انداز میں تو نے کھولے ہیں اسرار بہت
افسرؔ تیری رمز کی باتیں رہ رہ کر یاد آئیں گی



# ساز و برگ

سنہ ۱۹۴۸ء

خود اپنے دل سے ضو حاصل نہیں ہے
مہِ کامل، مہِ کامل نہیں ہے

مقامِ زندگی، اللہ اکبر!
خضر اب تک سرِ منزل نہیں ہے

ہے جوشِ سعی کا پیہم تقاضا
وہی مشکل ہے جو مشکل نہیں ہے

جہاں میں کیا مکاں کا ہو تصور
یہ موجِ بحر ہے ساحل نہیں ہے

میسّر کیسے تابِ جاوداں ہو
ابھی خود سوز[1] تیرا دل نہیں ہے

جو طوفانوں سے ٹکراتا نہیں سر
تماشائی ہے وہ ساحل نہیں ہے

گزر جا ہاں حرم سے بھی گزر جا
حرم اک راہ ہے منزل نہیں ہے

سنبھل کر گفتگو افسر سے کرنا
کہ وہ مزدور ہے سائل نہیں ہے

---

[1] خود سوز آذر بائیجان کے ایک آتشکدے کا نام تھا، جو کبھی بجھتا نہ تھا۔



# رزمگاہِ حیات

سنہ ۱۹۴۹ء

سبو ہے خشتِ بہ سر، جام ریز سنگ ہے ساقی
خبر بھی ہے کہ تیری بزم کا کیا رنگ ہے ساقی
دکھا وہ جذب قدموں میں اتر آئیں جہاں لاکھوں
کہ عرصہ اِس جہاں میں زندگی کا تنگ ہے ساقی

کہیں سے ڈھونڈ کر لا آفتابِ نَو کے جلووں کو
کہ تیرے میکدے کی صبح بھی شب رنگ ہے ساقی
خدا ہی ہی جو بچ جائے خزاں کی زد سے یہ محفل
مئے گل رنگ ہی ساغر میں شوخ و شنگ ہے ساقی
نہ پوچھ اسرار اس دو آتشہ کے میرے ساغر میں
شریکِ آبِ زمزم آبِ رودِ گنگ ہے ساقی
رکھے خود ہاتھ یزداں سن کے جسکو اپنے کانوں پر
کہاں تیری صدا اتنی بلند آہنگ ہے ساقی
یہیں آکر ہوئیں شیر و شکر دنیا کی تہذیبیں
اثر اب تک کنارِ آبِ رودِ گنگ ہے ساقی

تجھے اب تک نہیں ہے رفعتوں کا اپنی انداز
جبکہ قدموں پہ تیرے چرخ مینا رنگ ہے ساقی

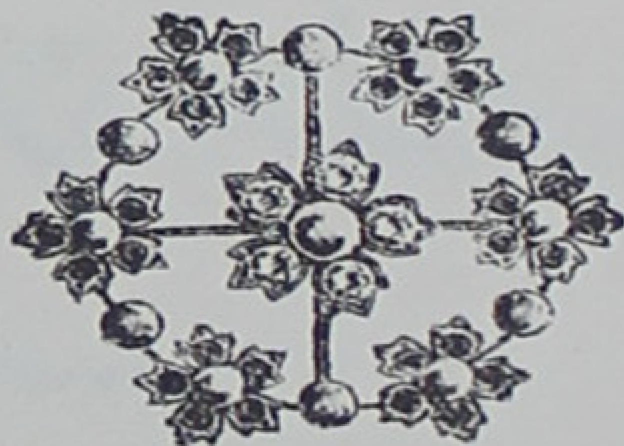
جہاں سودائی ہے توپ و تفنگ و بم کے نغموں کا
ابھی تک بزم تیری محوِ عود و چنگ ہے ساقی

ترے مینا میں اب یہ آگ دھیمی پڑ گئی کیونکر
جہندہ سوزِ الفت سے رگِ ہر سنگ ہے ساقی

یہ کیوں کر دوش پر لے کر چلیں گے بارِ آزادی
ترے مستوں میں ہر اک آج لُنج و لنگ ہے ساقی

جنھیں توفیق ہے وہ اب بھی کسبِ سوز کرتے ہیں
شراروں سے بھرا دامانِ کوہ و سنگ ہے ساقی

اسے رنگین کر دے آج پھر فیضِ بہاراں سے
تری محفل کی مدّت سے فضا بے رنگ ہے ساقی
کتابیں ہوں چمن ہو اور نعمت ہو فراغت کی
یہی تاج و نگیں و افسر و اورنگ ہے ساقی



Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# طرحِ نو

(بچّوں کے لئے)

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو دراندازیم

(حافظ)

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

مرض بن کے آیا شفا بن کے آیا
دوا بن کے آیا، دعا بن کے آیا

کبھی خود ہی اپنی صدا بن کے آیا
کبھی خود ہی اپنا پتا بن کے آیا

کبھی خود ہی اپنی ضیا بن کے آیا
کبھی خود ہی اپنے سوا بن کے آیا

اثر بن کے آیا، دعا بن کے آیا
سخا بن کے آیا، عطا بن کے آیا

مسافر کے دل میں سفر بن کے آیا
سفر کے لئے رہ گزر بن کے آیا

کبھی لب کبھی گفتگو بن کے آیا
کبھی دل کبھی آرزو بن کے آیا

---

تصوّر کے پردے میں تو خود نہاں تھا
تخیّل کی محفل میں جلوہ فشاں تھا

کہیں پہلے صحرا میں کھویا گیا تو
پھر اپنے تجسس میں گم تم بنا تو

خود عیسیٰ بنا خود ہی غمخوار بن کر
گلے سے لگایا اُسے دار بن کر

# بحضور خدائے لم یزل

سنہ ۱۹۳۲ء

خدا! اے خدا! میرا دل کہہ رہا ہے
کہ میں نے تجھے ہر جگہ پا لیا ہے

---

چمن میں نسیم سحر بن کے آیا
شجر کے لئے تو ثمر بن کے آیا
ہر اک چیز کا خود سبب بن کے آیا
دلوں میں خود اپنی طلب بن کے آیا

خودِ عیسیٰ بنا خود ہی غمخوار بن کر ۔۔۔ گلے سے لگایا اُسے دار بن کر
تو خود تیر بھی اور نخچیر بھی تھا ۔۔۔ تو نورِ جہاں بھی جہاں گیر بھی تھا
مٹا کر دوئی عبد و معبود تو تھا ۔۔۔ بتوں میں برہمن کے موجود تو تھا
مری نیند کا ناز بردار تو تھا ۔۔۔ میں سوتا رہا اور بیدار تو تھا
جہاں میں نئے رستے کو تاریک پایا ۔۔۔ تجھے رہنمائی کو نزدیک پایا
کوئی راہ چلتا اگر تھک گیا ہے ۔۔۔ تو اس کے لئے تو سہارا بنا ہے
جو پہنچا ہے تجھ تک وہ یہ کہہ رہا ہے ۔۔۔ کہ ہر راستہ تیرے در تک گیا ہے



# آفتاب

۱۹۴۰ء

ہر سحر کو جانبِ مشرق سے جب آتا ہے تو
اک رودِ نور اپنے ساتھ میں لاتا ہے تو
غفلتوں پر یک بہ یک ہوتی ہیں طاری غفلتیں
راگ بیداری کا اِس انداز سے گاتا ہے تو

اک مشجّر ساز میں پر بنتی ہیں کرنیں تری
نیم کی شاخوں میں جب آ کر اُلجھ جاتا ہے تو
پتّی پتّی کے ہیں دامن میں نمو کی دولتیں
زندگی کی لہر ہر ذرّہ میں دوڑاتا ہے تو
تیری بخشش کے ترانے ہیں چمن اندر چمن
رنگ سے ہر پھول کے دامن کو چھلکاتا ہے تو
بیش قیمت جوہروں کی شکل پا جاتے ہیں وہ
سنگ پاروں کے دلوں میں جب اتر جاتا ہے تو
ساتھ کرنوں کے تری، ہیں رقص میں اجزائے خاک
نور کی دولت سے ہر ذرّہ کو چمکاتا ہے تو

چمکے سے کرنوں کی سیڑھی پر چڑھا کر صبح کو
اپنے گھر شبنم کے ہر قطرے کو لیجاتا ہے تو
خوش بیاں افسر کا ہو جاتا ہے جب تو ہم نوا
آفتابِ آسمانِ شعر کہلاتا ہے تو



# ابرِ خراماں

۱۹۴۰ء

پھر وہ بادل کالے کالے آئے لہراتے ہوئے
آسماں پر ہر طرف پھرتے ہیں اتراتے ہوئے
نکلے ہیں تر کرکے دامن وادیوں کے فخر سے
پھر رہے ہیں کوہ کی چوٹی پہ منڈلاتے ہوئے

شور کرتے غل مچاتے اور گرجتے دم بدم
خوف سے دل کو مرے سینے میں دہلاتے ہوئے
وہ لٹاتے کشت زاروں میں نمو کی دولتیں
وہ کسانوں کو سنہرے خواب دکھلاتے ہوئے
تلملاتے، دندناتے، ڈگمگاتے، جھومتے
چرخ پر ہر چار سو پھرتے ہیں بل کھاتے ہوئے
ڈرتے ڈرتے چاند کے چہرے پہ آنچل ڈالتے
کہکشاں کی راہ سے نکلے ہیں شرماتے ہوئے
شاخساروں میں سے گذرے شوخیاں کرتے ہوئے
کھیلتے جھولا جھلاتے، وجد میں لاتے ہوئے

گھومتے پھرتے چلے پُروا ہَوا کے دوش پر
ہر چمن میں پیارے پیارے پھول برساتے ہوئے
ناخنوں سے برق کے سینہ کھُرچتے چرخ کا
جا رہے ہیں خشک میدانوں پہ غرّاتے ہوئے
پھر رہے ہیں ہر طرف مسرور کرتے خلق کو
ہجر کے شعلے ہمارے دل میں بھڑکاتے ہوئے



# گرمی کا موسم

سنہ ۱۹۴۴ء

جھونکے جو ہواؤں کے آنے لگے
آگ سی تن بدن میں لگانے لگے
گھس کے موکھوں میں سیٹی بجانے لگے
شور کرنے لگے غل مچانے لگے

---

اتنے گرمی سے نالاں پرندے ہوئے
منہ گھنی پتیوں میں چھپانے لگے

---

زور ہیں بھر کے پھر لو کے جھکڑ چلے　　　پھر پسینے کے دریا بہانے لگے

پھر چلیں آندھیاں پھر بگولے اُٹھے　　　گرد کے زرد بادل ہی چھانے لگے

خاک اُڑنے لگی، دھول کے دیو اُٹھے　　　پھر وہ طوفان رہ رہ کے آنے لگے

پھر زمیں کے بخارات اُٹھ کر چلے　　　شعلہ ریزی نفس کو سکھانے لگے

جسم پر نم یہ شبنم کا کھلنے لگا　　　ہو کے غرقِ عرق رسمسانے لگے

---

لالہ و گل کے شعلے بھڑکتے ہیں یا　　　پھول باغوں میں دھونی رمانے لگے

صبحیں پھر ہو گئی ہیں سہانی بہت　　　پھول شبنم کے موتی لٹانے لگے

صبح کو منہ اندھیرے ہی پھر آج کل　　　لوگ ندی پہ جا کر نہانے لگے

لے کے دامن میں جگنو، چمن وقتِ شب　　　پھر ستاروں کو آنکھیں دکھانے لگے

---

ہاں یہ سچ ہی غریبوں کا موسم ہے یہ   پھر وہ ہر سمت مل جل کے گانے لگے
تھے زمستاں میں افسردہ خاطر بہت   شادماں ہو کے اب مسکرانے لگے

---



# برسات میں تارے

۱۹۳۹ء

(۱)

آکاش کے نیلے ساگر میں جب تارے شب کو نہاتے ہیں
وہ جھل مل جھل مل کرتے ہیں اور ڈبکی ٹوپ لگاتے ہیں
اور کاہکشاں کے نام سے وہ اک چادر سی پھیلاتے ہیں

وہ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں اور آنکھوں کو جھپکاتے ہیں
برکھا کی اندھیری راتوں میں کیا تارے دل کو لبھاتے ہیں

(۲)

روپ ان کا من کو بھایا ہے چھب ان کی پیاری پیاری ہے
سپنے میں جیسے جاگتے ہیں کچھ ایسی غفلت طاری ہے
آکاش ہے سچ مچ یہ کوئی یا چاندی کا بیوپاری ہے
یا پھر یہ گگن کے پھولوں کی اک پیاری پیاری کیاری ہے
برکھا کی اندھیری راتوں میں کیا تارے دل کو لبھاتے ہیں

(۳)

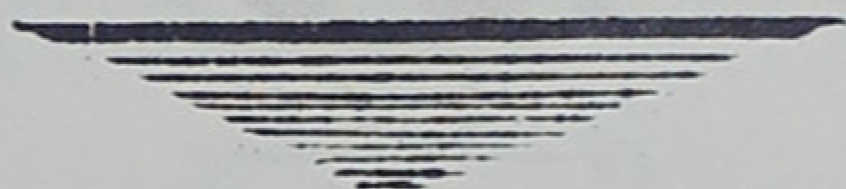
کیا پیارا پیارا نظارا ہے، کیا سندر روپ ہے تاروں کا

کیا دلکش منظر ہوتا ہے، آپس میں ان کے اشاروں کا

اک کھیت کسی نے بویا ہے، آکاش لپہ ان مے۔ پاروں کا

جاتا ہے کہاں پوچھیں کس سے، یہ قافلہ شب بیداروں کا

برکھا کی اندھیری راتوں میں کیا تارے دل کو لبھاتے ہیں



# گرمی کی بہار

۱۹۵۴ء

(بہ طرز نظیر اکبر آبادی)

(۱)

جب ذرہ ذرہ جلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی
رگ رگ سے پسینہ ڈھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی
جب لو کا جھکڑ چلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی

پتھر تک آگ اُگلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی
جب خون بدن میں ابلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی

(۲)

لت پت ہوں عرق میں سر تا سر اور دل سینوں میں دھڑکتے ہوں
ہوں دانے سرخ بدن بھر میں چھالوں کی طرح جو تپکتے ہوں
کچھ ایسے لحاف میں لپٹے ہوں اس میں سے نکل ہی نہ سکتے ہوں
پاس ایک انگیٹھی رکھی ہو اور شعلے اس میں بھڑکتے ہوں
ہر شعلہ پھولتا پھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی

(۳)

دروازہ کھلا ہو دوزخ کا دھرتی سے آگ نکلتی ہو

ہر چیز جہاں کی تپتی ہو، ہر چیز جہاں کی جلتی ہو
جب دھوپ کے شعلے کھا کھا کر ندی بھی آگ اگلتی ہو
جب اوڑھ کے تند و تیز ہوا اک دھول کی چادر چلتی ہو
پانی ندی میں اُبلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی

(۴۱)

لب خشک ہوئے جاتے ہوں جب اور حلق بھی سوکھا جاتا ہو
سب گھر میں گھس کر بیٹھے ہوں ہر چار طرف سناٹا ہو
اور کالی آندھیوں کا جب گرد و غبار سے ناتا ہو
جب مہر زمیں کی چھاتی کو تانبے کی طرح سے تپاتا ہو
دل ہولے ہولے جلتا ہو، تب دیکھ بہاریں گرمی کی

# آمدِ بہار

سنہ ۱۹۵۴ء

وہ پھر مسکرانے کو آئی بہار
وہ کلیاں کھلانے کو آئی بہار

ہے چھایا ہوا پتّی پتّی پہ حُسن
چمن کے سجانے کو آئی بہار

چمن میں جہاں حُسن تھا شادماں
وہاں دل لگانے کو آئی بہار

جہاں رنگ اُڑانے کو آئی خزاں
وہاں رنگ لانے کو آئی بہار

بجائے ہواؤں نے پتّوں کے ساز — وہ گانے بجانے کو آئی بہار

جو الجھے کہیں دامنِ گل سے خار — تو دامن چھڑانے کو آئی بہار

ہیں شبنم کے قطرے ہر اک پھول پر — یہ موتی لٹانے کو آئی بہار

بھڑکنے لگا شعلۂ رنگِ گل — تو دھونی رمانے کو آئی بہار

کیا اُس نے ہر اک کی آنکھوں میں گھر — دلوں میں سمانے کو آئی بہار

پڑا جس جگہ عکسِ گل نہر میں — وہیں جھلملانے کو آئی بہار

پڑی مردہ افسردہ پھولوں میں جان — یہ جادو جگانے کو آئی بہار

ہوئی جلوہ گر پھر وہ صبحِ نشاط — یہ مژدہ سنانے کو آئی بہار

کدورت سے ہے آج ہر سینہ پاک — دلوں کے ملانے کو آئی بہار

ہے آغاز دورِ نشاط و سرور — غمِ دل مٹانے کو آئی بہار

دلوں پر تھے غفلت کے پردے پڑے — یہ پردے ہٹانے کو آئی بہار

جو سبزے کی مانند غفلت میں ہیں — انھیں بھی جگانے کو آئی بہار

زمانے کو اب امن و راحت کا پھر — فسانہ سنانے کو آئی بہار

سبق ہم کو زندہ دلی کا دیا — وہ جینا سکھانے کو آئی بہار

اب آزاد اپنا چمن ہو گیا — کہیں اب نہ جانے کو آئی بہار



# پہاڑی ندی

سنہ ۱۹۳۹ء

کوہ سے ندی چلی آتی ہے لہراتی ہوئی
بے خودی میں ڈگمگاتی جھومتی گاتی ہوئی
اپنی ہی رفتار پر ہوتی ہوئی خود ہی نثار
اپنی موسیقی پہ خود ہی وجد میں آتی ہوئی

چرخِ نیلی فام کا حیرت سے منہ تکتی ہوئی
آرہی ہے آئینہ تاروں کو دکھلاتی ہوئی
اونچے نیچے کو ہچوں سے چھیڑ کرتی کھیلتی
چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ساتھ لڑھکاتی ہوئی
ڈھال سے گذری پھسلتی لڑکھڑاتی کودتی
موڑ پر رُکتی ہوئی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
کوہ کے سینے پہ ہر لحظہ مچلتی لوٹتی
وہ چلی آتی ہے دیکھو بل پہ بل کھاتی ہوئی
جیسے بجلی سوتے سوتے لے رہی ہو کروٹیں
جیسے اک ناگن سفید آتی ہو لہراتی ہوئی

جیسے اوندھا دے منوں نکھلی ہوئی چاندی کوئی
اک پری جیسے چلی آتی ہو اٹھلاتی ہوئی
موتیوں کو اس کا ہر قطرہ خجل کرتا ہوا
سنگ ریزوں کی چمک ہیروں کو شرماتی ہوئی



# غزلیات

از نہاں خانۂ دل خوش غزلے می خیزد

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |

(۱)

کمزور کشتی پرزور دھارا — پروردگارا! پروردگارا!

دل بھی تمھارا غم بھی تمھارا — یہ بھی گوارا وہ بھی گوارا

اب رات کا ہے اللہ مالک — دن کچھ نہ پوچھو کیونکر گزارا

کیا واسطہ ہے دنیا کو آخر — غم ہے تمھارا، دل ہے ہمارا

کس گھر میں تم کو ڈھونڈوں بتادو — یہ گھر تمھارا وہ گھر تمھارا
کچھ صبر کی بھی توفیق دیدے — ہوتا نہیں ہے غم پر گزارا
اے بحرِ رحمت! اے بحرِ رحمت! — ملتا نہیں ہے تیرا کنارا
دیکھا کیا ہوں میں ہجر کی شب — کا نیا کیا ہے ایک ایک تارا
ڈوبا ہمیشہ منجدھار میں وہ — جس نے کیا ہے تجھ سے کنارا
ہر کام یارب اس خاکداں میں — میں نے بگاڑا تو نے سنوارا
کہتی ہے دنیا دل جس کو افسر — سینے کے اندر ہے اک شرارا

(۲)

یہ حسن کی بزمِ رنگیں میں اک مجمع ہے دیوانوں کا
یا راہ کی برقی شمعوں پہ اک میلا ہے پروانوں کا

کیا رنگ ہے یہ، کیا حال ہے یہ، محفل ہے نہ محفل والے ہیں
اک ڈھیر سا ہے دروازے پہ کچھ ٹوٹے پھوٹے پیمانوں کا

اک وقت وہ تھا خود ہم ہی تھے اک فرد اپنے افسانوں کے
اب اتنا ہے سن لیتے ہیں ذکر اوروں کے افسانوں کا

انسان وہ ہے جو اکثر ٹھکرائے مصائب کو پیہم
ساحل جسے کہتی ہے دنیا ہمسایہ ہے طوفانوں کا

(۴۳)

دل قابو سے نکلے گا تو کیا جانے کیا کیا ہو گا
گھر گھر نام دھرے جائیں گے ہر گھر میں اک چرچا ہو گا

دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کا ہے کو ہوتی

اور کسی سے کیا مطلب ہے وہ خود کیا کہتا ہوگا

سچ تو یہ ہے اس دنیا میں حرکت سے ہی برکت ہے

جس نے کچھ ڈھونڈا ہو گا تو اُس نے کچھ پایا ہوگا

کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو

اس بادل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہو گا

چاند کی گردش تو اے افسرؔ ایک روش پہ قائم ہے

سرگشتہ یوں لاکھوں ہوں گے ہم سا کوئی کیا ہوگا

(۴۱)

کس نے بھر دی ہے یہ نغموں میں شراب

مست و بیخود ہو گئے چنگ و رباب

ایک ذرّہ بھی اُلٹ دے گر نقاب
اس جہاں میں کون لا سکتا ہے تاب
حُسن ہر پتّی کے اندر بے نقاب
حُسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب
چپکے چپکے کہتی آئی ہے خزاں
اب چمن میں آئے گا پھر انقلاب
کس سے پوچھوں حال اپنے دل کا میں
اب تو خود سے بھی ہے مجھ کو اجتناب
کس قدر پُر لُطف ہے اپنا سفر
راہبر خود دل ہے، منزل ہمرکاب

دیر و کعبہ پر حقیقت تو کھلے
اب الٹ ہی دیجئے رُخ سے نقاب
جب سفر افسرؔ کبھی کرتے نہیں
دیکھتے پھر کیوں ہو تم منزل کے خواب

(۵)

ڈھونڈنے والے جو پیدا ہوں تو سب کچھ ہے یہیں
چھپنے والا کہہ رہا ہے ڈھونڈنے والے نہیں
اُف رے یہ ذوقِ عبادت کی عجائب کاریاں
دل کہیں ہے میں کہیں سجدہ کہیں ہے سر کہیں
موت ہے وہ راز جو آخر کھلے گا ایک دن

زندگی ہے وہ معمّا کوئی جس کا حل نہیں

بُعدِ ظاہر کچھ نہیں ہلکے سے پردے کے سوا

ہم یہیں ہیں تم یہیں گو ہم کہیں ہوں تم کہیں

چاہتے ہیں اب تو یہ سودائیانِ جستجو

کاش منزل پر کوئی کہدے کہ یہ منزل نہیں

ہیں مرے اشعار افسرؔ اگلی نسلوں کے لیے

سننے والے میرے نغموں کے ابھی آئے نہیں

(۶)

برسات کے یہ دو چار تارے شام سے سوئے جاتے ہیں

جھینگر کی دھیمی آوازوں میں نیند کے جھونکے آتے ہیں

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا کیا ضبط کریں کیا صبر کریں
مجھ جیسے کاش وہ ہو جائیں جو آ کر سمجھاتے ہیں
دل غم سے بیٹھا جاتا ہے کیا حال کہوں ہمدردوں سے
لکنت سی زباں میں ہوتی ہے جب پوچھنے والے آتے ہیں
کس درجہ شوخ طبیعت ہیں یہ عشق و محبّت والے بھی
برسات کی تنہا راتوں میں گا گا کر دل بہلاتے ہیں
ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغامِ حیاتِ جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھِلنے کو مرجھاتے ہیں
دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبّت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھُل کھُل کر رہ جاتے ہیں

ہے حسن کی دنیا بھی افسرؔ محروم سکوں کی نعمت سے
دل دھک دھک کرنے لگتا ہے جب سامنے وہ آجاتے ہیں

(۷)

یہ دلنواز نغمے جنگل کی خامشی میں — لرزہ سا آرہا ہے تاروں کی روشنی میں
لِلّٰہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت — کیا حُسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں
ساون کی رات میں ہے مہتاب جلوہ فرما — یا نغمے سو رہے ہیں خاموش چاندنی میں
مرنے کے بعد بھی تو ہے فکر زندگی کی — اتنا کبھی ہو نہ انساں سرشار زندگی میں
یہ پردۂ سحر میں فرقت کی تیرگی ہے — یا غم چھپا ہوا ہے دنیا کی ہر خوشی میں

جنگل کی رات افسرؔ گو پُر خطر ہے لیکن
اُمید کی جھلک ہے بستی کی روشنی میں

(۸)

تیرگی میں جنگل کی چاند جب نکلتا ہے — حسن ذرے ذرے پر کروٹیں بدلتا ہے

یہ بھی اک تماشا ہے کارزارِ الفت میں — دل کسی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلتا ہے

رات اِن کی گردش میں کیا سے کیا ہوئی دنیا — کس قدر زمانہ بھی کروٹیں بدلتا ہے

اس جہاں میں ہستی کی رات یوں گزرتی ہے — اک چراغ بجھتا ہے اک چراغ جلتا ہے

حال پوچھنے والے! حال کیا بتاؤں میں — اب لہو بھی رگ رگ میں درد بن کے چلتا ہے

بے اثر نہیں ہوتا نالہ جس کو کہتے ہیں — دل میں جا اترتا ہے دل سے جب نکلتا ہے

اس قدر بھی الفت میں ہو نہ کوئی بے قابو — دل میں سوچتا کیا ہو منہ سے کیا نکلتا ہے

زندگی مری افسر اضطرابِ پیہم ہے
میں تو کانپ جاتا ہوں دل اگر سنبھلتا ہے

(۹)

ہوں محوِ ذات اتنا کہ بیخود ہوں مست ہوں
اب میں خدا پرست نہیں، خود پرست ہوں

وحشت میں کس کو صاحبِ دامن کا ہوش ہے
اتنا تو جانتا ہوں کہ دامن بدست ہوں

یا محو ہو گیا ہوں میں خود اپنے شعر میں
یا کیف گیرِ نغمۂ روزِ الست ہوں

اللہ رے طلسمِ عناصر کی وسعتیں!
میں کیا ہوں اِس طلسم کا اک بند و بست ہوں

اتنی کبھی کیف ریز چمن میں نہ ہو بہار

ہر شاخ کو گماں ہے کہ ساغر بدست ہوں
افسرؔ مری نظر میں ہیں کُل شب کی منزلیں
میں ایک رہ نوردِ سکوں مہ پرست ہوں

(۱۰)

کہاں وہ زمانہ کہاں اب وہ باتیں — وہ تم اور میں اور وہ ساون کی راتیں
ہمارے زمانے کا دستور یہ ہے — وہی جیتتے ہیں جو کھاتے ہیں ماتیں
ہیں آموں کے باغوں میں نغمے رسیلے — یہ ساون کی راتیں ہیں کوئل کی راتیں
یہ گورِ غریباں کی بستی عجب ہے — نہ تو میں یہاں ہیں نہ فرقے نہ ذاتیں
کوئی دل پہ قابو بھی رکھے کہاں تک — جوانی کے دن اور ساون کی راتیں
یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسرؔ — ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

(۱۱)

اُن کے کوچہ میں یہ ہم جا کے صدا دیتے ہیں
بُت کے بدلے میں کوئی لے تو خدا دیتے ہیں
اک جھلک یوں بھی مسرت کی دکھا دیتے ہیں
رات کو صبح کے پہلو میں سلا دیتے ہیں
ہائے کیا شغل محبت میں ہے دیوانوں کا
دل کی تصویر بناتے ہیں مٹا دیتے ہیں
پوچھتا ہے جو محبت کی حقیقت کوئی
حال ہم دل کی تباہی کا سنا دیتے ہیں
کیفیت ان کے کرم کی کوئی ہم سے پوچھے

جس سے خوش ہوتے ہیں دیوانہ بنادیتے ہیں
چھپنے والے تجھے مخصوص کریں ہم کیونکر
تیرا در ہوتا ہے جس در پہ صدا دیتے ہیں
پوچھتا ہے جو کوئی حال ہمارا افسر
شعر ہم ایسے ہی دو چار سنا دیتے ہیں

(۱۲)

جب دل کی بے کلی کا سبب پوچھتا ہوں میں
کہتا ہے کوئی درد نہیں ہوں دوا ہوں میں
ہوں میں بھی اپنے ڈھونڈنے والوں میں دیکھنا!
شاید یہ ہوش ہے کہ کہیں کھو گیا ہوں میں

خود داریاں یہ میرے تجسس کی دیکھنا
منزل پہ آکے اپنا پتہ پوچھتا ہوں میں
اُن پیاری پیاری آنکھوں پہ الزام کیا رکھوں
دل سے ستم ظریف کا مارا ہوا ہوں میں
رکھ کر نظر کے سامنے تصویرِ خوابِ ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

(۱۳)

صدائیں آتی ہیں دھیمے سُروں میں گانے کی
اب آج پھر نہیں اُمید نیند آنے کی
غضب کے دیکھنے والے ہیں یہ ستارے بھی

کہاں سے دیکھ رہے ہیں ہوا زمانے کی
فسانہ خواں تری آنکھیں قصور وار نہیں
میں جانتا ہوں خطا ہے مرے فسانے کی
یہ جھومتے ہوئے تارے فلک پہ نکلے ہیں
کہ مشعلیں ہوئیں روشن شراب خانے کی
قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید
کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اُٹھانے کی
جہاں نہ گھر ہو کوئی نام کو بھی اے افسرؔ
ہے فکر ایسی جگہ ایک گھر بنانے کی



(۱۳)

اثر دیکھا دعا جب رات بھر کی
ضیا کچھ کچھ ہے تاروں میں سحر کی

ہوئے رخصت جہاں سے صبح ہوتے
کہانی ہجر کی یوں مختصر کی

تڑپ اُٹھے لحد کے سونے والے
زمیں کی سمت کیوں تم نے نظر کی

سحر کو موت کی مانگیں دعائیں
دعا مقبول ہوتی ہے سحر کی

یہ بجلی ہے کہ اے ابرِ شبِ ہجر
ہے دھجی ایک دامانِ سحر کی

سحر دیکھیں یہ حسرت لے گئے ہم
بتائیں کیا تمھیں کیوں کر سحر کی

یہ خوش سامانیاں وحشت کی افسر
کہ جنگل میں بنا ڈالی ہے گھر کی



(۱۵)

یہ اُس کے دل سے پوچھو تم ہوتی ہے سحر کس آفت سے
آنکھوں میں گزاری ہوں جس نے یہ لمبی راتیں جاڑوں کی
یہ بادل کالے کالے جو، سرِ شام چلے ہیں مغرب کو
تصویر فلک پہ اتاریں گے اب اونچے اونچے پہاڑوں کی

(۱۶)

انھیں نصیب کہاں شان بے نیازی کی — ہے سچ تو یہ کہ تبوں نے زمانہ سازی کی
کمالِ عشق میں نیرنگِ حُسن ہوتا ہے — ہوا ہے یوں بھی کہ محمود نے ایازی کی
مری خموشی کو وحشت سے بے نیاز نہ کہہ — کہ ایک یہ بھی ادا ہے جنوں نوازی کی
مہ دو ہفتہ کی کرنوں میں کان اُٹھے نغمے — یہ کس نے شب کی خموشی ہیں نے نوازی کی

بڑھا کے ریش تو مسجد کو کیا چلا افسرؔ
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

(۱۷)

دوزخ جسے کہتے ہیں فرشتے بھی بشر بھی
جنت ہی کو جاتی نہ ہو وہ راہ گذر بھی
کیوں اتنا ہے منزل کے تصور سے گرانبار
طے ہوتے ہیں بے توشہ و بے زادِ سفر بھی
کچھ سرد ضرورت سے زیادہ ہے ترا دل
بے سوز سے ہیں کچھ مری آہوں کے شرر بھی
تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے

جنّت جسے کہتے ہیں اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کہتے ہوئے یہ رات کو آئے ہیں ستارے
پردے سے اسی رات کے نکلے گی سحر بھی
ساماں نہ ہو گر سوزشِ پیہم کا میسّر
دب جاتے ہیں خود خاک میں اپنی ہی شرر بھی

(۱۸)

جو جینا ہو تو پہلے زندگی کا مدّعا سمجھے
خدا توفیق دے تو آدمی خود کو خدا سمجھے
مجھے اے چاند تیری منزلوں پر رشک آتا ہے
مسافر وہ نہیں ہے جو سفر کا مدّعا سمجھے

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بو لٹنے والے
کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

حیات و موت دو کڑیاں ہیں اک زنجیر کی افسر
کوئی کیا ابتدا سمجھے کوئی کیا انتہا سمجھے

(۱۹)

فصل ہے برسات کی جنگل ہے وقتِ شام ہے
ایک تارا ہے سو وہ بھی رعشہ بر اندام ہے

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہ ہائے جاں فزا

مُرغِ خوش پرواز! آزادی اسی کا نام ہے
یہ گھٹائیں یہ ہوائیں اور یہ ساون کی جھڑی
بے حسی کی حد ہے افسرؔ آج بھی کچھ کام ہے!

(۳۰)

بُت بنے بت کا پجاری بنے بتخانہ بنے
لاکھ گو تجھ سا بنے کوئی پہ تجھ سا نہ بنے
یا تو ہونا نہ تھا ہر ذرّہ میں یوں جلوہ نما
یا یہ کہنا تھا کہ ہر ذرّہ میں بتخانہ بنے
ہائے وہ جس کی اُمیدیں ہیں خزاں پر موقوف
شاخِ گل سوکھ کے گر جائے تو کاشانہ بنے

اُف رے وحشت کوئی پردہ نہیں رہتا باقی
ہوش کی جس کو تمنا ہو وہ دیوانہ بنے
کیف ساماں کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا افسرؔ
آنکھ جس پھول پہ ڈالوں وہی پیمانہ بنے

(۲۱)

اگر آنکھ کو دل سے آنسو ملے ——— تو آنسو میں جلوہ فگن تو ملے
یہ دیر و حرم میں کہاں پھنس گئے ——— اُسے ڈھونڈنا کیا جو ہر سو ملے
نتیجہ ہے یہ جستجو کا مری ——— میں خود کو ملوں تو مجھے تو ملے
مقولہ ہے گم ہونے والوں کا یہ ——— اسے چاہیئے کیا جسے تو ملے
بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف ——— خدا جانے کس بھیس میں تو ملے

نہ افسردہ ہو کیوں شام کا رنگ فق
اچانک اگر وہ لبِ جو ملے

(۲۲)

دنیا کا ہر اِک عیشِ بدیہی نظری ہے
شبنم نہیں یہ صبح کی آنکھوں میں تری ہے
غم اصل میں غم ہو تو نہیں مانعِ راحت
اس گیسوئے شب میں بھی طلائے سحری ہے
شب سے نہیں کم ہجر کے ماروں کی سحر بھی
یعنی وہی غفلت ہے وہی بےخبری ہے
اب آپ اسے راکھ کہیں یا دل کی تمنّا
اک آگ سی افسر مرے سینے میں بھری ہے

(۲۳)

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے

چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے
سکونِ قلب کو ہلکی سی بھی اُمید کافی ہے
کہ نورِ صبح کی پہلی کرن باریک ہوتی ہے
نظر کو روک لے اے حُسنِ بے پردہ کے متوالے
کہ اِن بیتابیوں سے شوق کی تضحیک ہوتی ہے
وہ دولت جس کا دُنیا نے مسرّت نام رکھا ہے
ترے جلوؤں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے
ہمیں اب زندگی کا خواب افسرؔ یاد آتا ہے
یہی وہ خواب ہے تعبیر جس کی ٹھیک ہوتی ہے

(۲۴)

دل میں گھر کرنے کے انداز کہاں سے لاؤں

ہو اثر جس میں وہ آواز کہاں سے لاؤں

آج صیّاد نے گھبرا کے قفس کھول دیا

ہائے اب طاقتِ پرواز کہاں سے لاؤں

چٹکیاں لیتی ہے ہر بات تمھاری دل میں

ہیں یہ گفتار کا انداز کہاں سے لاؤں

شعر میں کیفِ بہاراں کا اثر کیا آئے

ہند میں بادۂ شیراز کہاں سے لاؤں

ساری دنیا کو جو ہمراز بنا لے اپنا

ہائے ایسا کوئی ہمراز کہاں سے لاؤں

(۲۵)

بزم میں تیری کوئی بے خود کوئی مدہوش ہے
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

سامنے بُت ہیں تو رسوائی کا کس کو ہوش ہے
یا الٰہی! تو گنہگاروں کا پردہ پوش ہے

بزم میں اِن مدھ بھری آنکھوں کو گردش دے مگر
اِس کا اندازہ تو کر لے کس کو کتنا ہوش ہے

جراءتِ دیدار کیسی، تابِ نظّارہ کہاں
آرزوئے دید تمہیدِ وداعِ ہوش ہے

یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلائی ہوئی

کچھ تمھیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے
یہ تپش، یہ اضطرابی، یہ تڑپ، یہ بے کلی
دل ہے افسر میرا یا اک محشرِ خاموش ہے

(۲۶)

دکھاوے کے ہیں سب دنیا کے میلے بھری بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
ہمیں صبر بھی عشق ہی نے سکھایا کہیں کیا کہ ہم کس گرو کے ہیں چیلے
بہت اُن کو باطن میں ہشیار پایا بظاہر جو ہوتے ہیں الھڑ انیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے پڑے رہتے ہیں گھر میں افسر اکیلے

(۲۷)

بھری کیسے کیسے معانی سے جھولی کسی لفظ نے پر حقیقت نہ کھولی

نظر سے نظر کہہ گئی رازِ اُلفت　　نہیں ہے یہ لفظوں کی محتاج بولی
کہیں کی رہی گی نہ آوارہ ہو کر　　یہ خوشبو جو پھولوں نے کانٹے پہ تولی
اکیلا رہا بھیڑ میں اِس جہاں کی　　کسی نے یہاں میری بولی نہ بولی
تھکے ڈھونڈ کر دیر و کعبہ میں جس کو　　ملا جب کبھی دل کی بستی ٹٹولی

(۲۸)

منزل سے بھٹکی ہوئی راہیں　　پردیسی کے لب پر آہیں
ایک کے بس کی بات نہیں ہے　　تم بھی نباہو، ہم بھی نباہیں
کچھ تو اِس سے جی ہلکا ہو　　تنہا ہوں تو خوب کراہیں
یہ تم اپنے دل سے پوچھو　　ڈھونڈ رہی ہیں کس کو نگاہیں
دنیا کی ہر چیز ہے بے بس　　ہوتا ہے جو کچھ وہ چاہیں

دیکھ کے کیا آئے ہو افسر
کچھ گھبرائی سی ہیں نگاہیں

(۲۹)

کچھ تو وحشت میں اضافہ کیجئے
یعنی ہر ذرّے کو صحرا کیجئے

کہتے ہیں دستورِ اُلفت ہے یہی
درد سے پیدا مداوا کیجئے

کچھ توجّہ خاص ہوتی ہے عیاں
نام لے کر نہ کوسا کیجئے

ہم نے کچھ پوچھا تو وہ کہنے لگے
آپ ہم سے کچھ نہ پوچھا کیجئے

مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

کون انھیں افسر سنائے گا غزل
کیا فراہم دل کے اجزا کیجئے

(۳۰)

پیری میں آ رہے ہیں جوانی کے ولولے
گویا نمودِ صبح کی خواہش ہے دن ڈھلے

منزل نہیں ملی تو ہمارا تھا کیا قصور
ہم دل کے ساتھ بہت دُور تک چلے

ہو قُرب اور پھر وہی دل بستگی رہے
ہیں اصل میں یہی تو محبت کے مرحلے

واں اُن کو یہ گمان کہ دامن بھی تر نہیں
یاں حال یہ کہ آگیا پانی گلے گلے

افسر زمیں کے نیچے تڑپتا ہے کوئی دل

## کیوں ورنہ روز روز یہ آتے ہیں زلزلے

(۳۱)

حالِ دل پوچھتے ہو کیا مجھ سے
کوئی اُجڑا دیار دیکھا ہے

کتنے پشمینہ پوش جسموں میں
روح کو تار تار دیکھا ہے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
کاروانِ بہار دیکھا ہے

دل سے پوچھو کہ آج اِن آنکھوں نے
کیا سرِ رہگزار دیکھا ہے

موت کا راز کُھل گیا ہوگا
گر کبھی انتظار دیکھا ہے

(۳۲)

درس خوشی کا دیتا ہے راتوں کا اندھیارا ابھی
نور و ضیا کا مرکز ہے چھوٹے سے چھوٹا تارا ابھی

اُٹھ کر اے کھینے والے ہمّت کے پتوار لگا
کشتی ہے ٹوٹی پھوٹی دُور ابھی ہے کنارا ابھی

اِس دُنیا کا جینا بھی سچ پوچھو تو کھیل سا ہی
بازی اُس کے ہاتھ رہی جو جیتا بھی ہارا بھی

پھونک کے رکھ دیتا ہے وہ سارے جہاں کو اے افسرؔ
دل میں ہو موجود اگر اک چھوٹا سا شرارا بھی

(۳۳)

کیوں تیر کوئی آج نگاہوں میں نہیں ہے
آہیں ہیں مگر سوز کچھ آہوں میں نہیں ہے
ہوتی ہے جو منزل کے تصوّر سے نمودار

کیوں آج وہ رونق کہیں راہوں میں نہیں ہے
یا سوزِ دروں سے ہوا محروم زمانہ
یا یہ کہ اثر ہی مری آہوں میں نہیں ہے
دیوانہ ہے کامل تو ہے منزل سے ہم آغوش
سرگشتہ و شوریدہ وہ راہوں میں نہیں ہے
راحت کو زر و مال سے نسبت نہیں کوئی
دولت یہ فقیروں میں ہے شاہوں میں نہیں ہے
احساسِ گنہ جذبِ کرم سے ہے سرافراز
زاہد یہ مزا تیرے گناہوں میں نہیں ہے
خود ہی تو دیا آپ نے اذنِ کرمِ عام

اب کوئی بھی ناکردہ گنا ہوں میں نہیں ہے

ہے تیرے لئے سارا جہاں حسن سے خالی

خود حسن اگر تیری نگا ہوں میں نہیں ہے

(۳۴)

ہوا تھا جہاں ختم اپنا فسانہ وہیں دم بخود رہ گیا ہے زمانہ

ہمیں رہ گئے راہ میں پا شکستہ ہوا کارواں سوئے منزل روانہ

چمن میں گزر ہے نہ صحرا میں پرسش بناؤں کہاں جا کے اب آشیانہ

حرم کو یہاں دیر سے ہی یہ نسبت نہ یہ جا و دانہ نہ وہ جا و دانہ

بتوں میں بھی دیکھا ہی جلوہ خدا کا

ہے دل عارفانہ نظر کا فرانہ

(۳۵)

جہنم یہیں ہم نفس بن گیا
کہ زاہد تسکا یہ ہوس بن گیا

کچھ اس طرح ٹوٹا ہمارا قفس
کہ ہر آشیانہ قفس بن گیا

یہ رفتار کیوں سست ہے وقت کی
ہر اک لمحہ ایک اک برس بن گیا

رہی اب یہاں حسن کی قدر کیا
کہ عاشق ہر اک بوالہوس بن گیا

جو نالہ قفس میں کیا تھا کبھی
وہی قاصدِ زود رس بن گیا

خود اپنے ہی ہاتھوں سے اے ہم نفس
چمن کا چمن خار و خس بن گیا



# قطعات و رُباعیات

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

(۱)

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو بامِ تازہ
جھپک سے تیری، تاریکی کا ہو جاتا ہے اندازہ
نظر پر ہو گئیں قصرِ الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

(۲)

شاعرِ ماضی کو اُلفت تھی جمالِ حُور سے
یا لپٹ کر رو بھی لیتا تھا شبِ دیجور سے
آج کل شعر و سخن کا رنگ ہے بدلا ہوا
ہو گیا ہے شاعروں کو عشق اب مزدور سے

(۳)

حُسنِ ظاہر کی جھلک دنیا کو دکھلانے لگے
ہلکے ہلکے نور کے دھاگے سے لٹکانے لگے
ایک ہی تارے سے لرزاں تھا نظامِ کائنات
کچھ نئے تارے فضاؤں میں نظر آنے لگے

(۴)

اِس خاک پہ یہ رحمتِ حق چھا گئی کیونکر
اِس چیز کو دنیا کی فضا بھا گئی کیونکر
موسیقی تو سنتے ہیں فرشتوں کی ہے آواز
یہ نعمتِ فردوس یہاں آ گئی کیونکر

(۵)

ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سرافراز
فطرت کے ہر انداز سے افشا ہے یہی راز
پرواز سے مل جاتی ہے جگنو کو تب و تاب
تاریک ہے جگنو کا جہاں گر نہ ہو پرواز

(۶)

ساعتِ عیش و مسرّت آج اے دل کیا ہوئی
سعیِ لاحاصل کہاں ہے، سعیٔ حاصل کیا ہوئی
کس قدر خاموش و افسردہ ہے صبحِ انقلاب
رات جس میں شور برپا تھا وہ محفل کیا ہوئی

(۷)

غلطی کرتا ہے انسان بہت
اِس کا سب ہی سے ہے امکان بہت
لیکن اتنا رہے اے دوست خیال
غلطی ہوتی ہے لسّان بہت

(۸)

جو آگاہی کا ہو دل میں نشاں بھی
عیاں صدیوں کا ہو سِرِّ نہاں بھی
نکل جا روز و شب کی بندشوں سے
زماں ہے مستقل بھی جاوداں بھی

(۹)

وہ شان، وہ دبدبہ، وہ ہمت، وہ جوش و دبرہمی نہیں ہے
سکوں میسّر نہیں وہ دل کو نصیب وہ بےغمی نہیں ہے
جہاں سے رخصت ہوئی شجاعت یہی تھا انسانیت کا جوہر
گلوں سے ذرّہ کو چھوڑ دینا، یہ کچھ بھی ہو، رستمی نہیں ہے

(۱۰)

گزرے ہوئے دُکھ کا پھر اُبھرنا کیسا
بیتے ہوئے غم کا یاد کرنا کیسا
گزرے ہوئے سال والی سردی کے لئے
اِس سال کی گرمی میں ٹھٹھرنا کیسا

(۱۱)

بے روح سی بے جان سی پھر آج ہے دُنیا
ویران ہے برباد ہے تاراج ہے دُنیا
اب منہ نہیں یزداں سے کُن سُننے کا افسر
انسان سے کُن سننے کی محتاج ہے دنیا

(۱۲)

کہا یہ شیخ نے خطبہ میں راہِ صدق وصفا
سکھاتے ہیں ہمیں اسکول اِس زمانے میں
یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے افسر
شراب ملتی ہے شیشے کے کارخانے میں

(۱۳)

کہرام کُل جہان میں اُس کے ستم سے تھا
خالی نہ ایک گھر بھی تو رنج و الم سے تھا
ہٹلر میں لاکھ عیب سہی لیکن اے ندیم
قوموں میں اتحاد تو کچھ اُس کے دم سے تھا

(۱۴)

صحیفۂ روزگار کا وہ ابھی تک عنواں نہیں بنا ہے
ابھی وہ شیطاں نہیں بنا ہے، ابھی وہ یزداں نہیں بنا ہے
ابد کے اس بحرِ بے کراں میں نہ تیرتا ہے نہ ڈوبتا ہے
جہاں میں آ گیا ہے انساں پر اب تک انساں نہیں بنا ہے

(۱۵)

دعا آرزوؤں کی ہمراز ہے
یہ غمخوار و دلسوز و دمساز ہے
سہارا ہے تسکینِ دل کے لئے
یہ میرے بھروسے کی آواز ہے

(۱۶)

چلتا ہے یہ ہر مرضی ٹھکرا کے بڑھاپے کی
رہ جاتی ہے عقل آخر چکرا کے بڑھاپے کی
بے چین ہے، بے کل ہے۔ خود دار ہے، خود سر ہے
اولاد ہے امریکہ دنیا کے بڑھاپے کی



Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# گوہرِ یک دانہ

قطرۂ کز موج دامن چید گوہر می شود

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

| BORROWER'S NO. | ISSUE DATE | BORROWER'S NO. | ISSUE DATE |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

اک دن طلوع ہو گا فردا نئے سرے سے
ہوتی ہے روز پیدا دنیا نئے سرے سے

---

حال یہ ہے ربطِ اقوامِ جہاں کا آجکل
خوش گمانی کی طلب ہے بدگمانی دل میں ہے

اپنے اوپر کر بھروسا، جذبِ دل سے کام لے
یوں نہ ساقی آئے گا، اُٹھ بڑھ کے مینا تھام لے

---

جہاں کے گلزارِ زندگی میں ہوائیں کیسی چل رہی ہیں
کہ فردم جھاکے رہ گئے ہیں، جماعتیں پھول پھل رہی ہیں

مل جائے جو تجھ سے جا کر ایسا کس کا مقدر ہے

دریا میں جو قطرہ ہے، وہ دریا ہی یا گوہر ہے

---

ترقّی کر کے دنیا کی ہر اک شے ہو گئی بہتر

مگر انساں ہی با وضع کتنا! وہ نہیں بدلا

نہ پایا جب حقیقت کو کسی نے

خدا پیدا کیا ہر آدمی نے



مذاہب کیا ہیں راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی

ہے منزل کیا جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ملتیں

# ہماری نئی کتابیں

**شرحِ دیوانِ اردوئے غالب**
طباطبائی ۸؎

**اُردو میں تنقید**
محمد احسن فاروقی ۲؎

**طرۂ میر**
امیر احمد علوی عہ

اضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن
**حسرت موہانی**
از عبد الشکور ایم اے عہ

**ہندی کے مسلمان شعراء**
امیر حسن نورانی ۱۲؎

**شاہانِ مالوہ**
امیر احمد علوی ۶؎

**اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں**
عبد الماجد دریابادی ۲؎

**ابو الخیر**
مجنوں گورکھپوری ۶؎

**یادگارِ انیس**
امیر احمد علوی عہ

**اُردو کے ہندو ادیب**
ناظر کاکوروی عہ

**سنہرا حلقہ**
ناظر کاکوروی ۲؎

**شعلۂ طور**
جگر مرادآبادی ۴؎

## ہماری عنقریب شائع ہونے والی کتابیں

**اپنی موج میں**
آوارہ حیدرآبادی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

**مضامینِ تنقید**
آلِ احمد سرور

**سفرنامۂ امریکہ**
احتشام حسین

**ادبی تنقید**
ڈاکٹر محمد حسن (پروفیسر لکھنؤ) اٹھارہ مشہور مصنفین پر ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے

ملنے کا پتہ: - ادارۂ فروغِ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ